اردو ڈائرکٹوریٹ
حکومت بہار
بہار، پٹنہ

سلسلہ نمبر۔۲۰

قمر اعظم ہاشمی

انوار الحسن وسطوی

Monograph-20

Qamar Azam Hashmi

By : Anwarul Hasan Wastavi

قمر اعظم ہاشمی اردو زبان وادب اور بہار کی اردو تحریک کے حوالے سے مستند اور معروف شناخت کے حامل ہیں۔ وہ بنیادی طور پر اردو کے استاذ تھے۔ طلبہ میں بے حد مقبول اور محترم۔ اردو ادب میں ایک ناقد، ایک محقق اور ادیب کی حیثیت سے بھی ممتاز اور معروف ہیں۔ بہار کی اردو تحریک سے ان کا رشتہ بہت مضبوط، طویل اور مثالی رہا۔ وہ انجمن ترقی اردو بہار کی مجلس عاملہ کے رکن اور نائب صدر بھی رہے۔ وہ اردو کے فروغ کے لئے آخری سانس تک دیوانہ وار سرگرم عمل رہے۔

بحیثیت محقق، ناقد اور ادیب انھوں نے مختلف اصناف پر اٹھارہ قابل قدر کتابیں تصنیف اور تالیف کیں۔ جن میں ''فکر وفن''، ''اردو میں ڈرامہ نگاری''، ''بہار کے نظم نگار شعراء''، ''عصری ادب کا شعور''، ''مثنوی سحر البیان''، ''انتخابِ ذوق'' وغیرہ قابل ذکر کتابیں ہیں۔ بحیثیت مدیر ''ساغر نو'' انھوں نے اختر اورینوی پر جو خاص شمارہ شائع کیا وہ یادگار اور دستاویزی ثابت ہوا۔ انھوں نے ''سرسری اس جہان سے گزرے'' کے عنوان سے اپنی سوانح حیات لکھی جو بہت دلچسپ اور معلوماتی تصنیف ہے۔ انھوں نے کئی نصابی کتابوں کی تدوین بھی کی، جو وقتاً فوقتاً بہار کی مختلف یونیورسٹیوں اور کالجوں کے نصاب میں داخل رہیں۔

قمر اعظم ہاشمی کی پوری زندگی اردو زبان وادب کی خدمت سے عبارت رہی۔ اردو ادب ہو یا اردو تحریک ہر جگہ ان کا کردار نمایاں اور ممتاز رہا۔ اردو کی نئی نسل کی کردار سازی اور ان کی آبیاری میں وہ خصوصی دلچسپی لیتے تھے۔ آج بھی ان کے شاگردوں کی خاصی تعداد اردو زبان و ادب کے میدان میں اپنا نمایاں کردار ادا کر رہی ہیں۔ جن میں پروفیسر اسلم آزاد، پروفیسر منظر اعجاز، پروفیسر محمود نہسوی، پروفیسر حسن عباس، پروفیسر حامد علی خاں وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

بہار کی اردو تحریک میں قمر اعظم ہاشمی نے ایک جانباز سپاہی کا کردار ادا کیا۔ انجمن ترقی اردو کے بینر تلے انھوں نے غلام سرور، محمد ایوب ایڈووکیٹ، بیتاب صدیقی، شاہ مشتاق احمد، رامائن سنگھ، سہیل عظیم آبادی، عبدالقیوم انصاری وغیرہ کے ساتھ اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دلانے کی تحریک میں شامل ہو کر طویل عرصے تک جدو جہد کرتے رہے اور اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دلا کر ہی دم لیا۔ انجمن ترقی اردو بہار کو تقویت دینے اور اردو تحریک کو تیز تر کرنے میں قمر اعظم ہاشمی کا کردار مثالی رہا۔

بحیثیت اردو استاد، بحیثیت اردو ادیب اور بحیثیت اردو تحریک کار قمر اعظم ہاشمی کی حیثیت ایک بہتر نمونہ اور مثال ہے، جو نئی نسل کے لئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس فردنامے کے مصنف انوار الحسن وسطوی اردو کے ایک معروف و معتبر ادیب اور مبصر ہیں۔ ان کی آٹھ ادبی، لسانی اور علمی کتابیں شائع ہو کر ان کی صلاحیت کی گواہ بن چکی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وسطوی صاحب ایک سرگرم اردو تحریک کار بھی ہیں۔ ان کی تحریکی زندگی چار دہائیوں پر محیط ہے۔ انھیں قمر اعظم ہاشمی کے ساتھ تحریکی سرگرمیوں میں شانہ بہ شانہ جدو جہد کرنے کا شرف حاصل رہا ہے۔ وہ ان سے قریب بھی رہے ہیں۔ لہٰذا ان کا تحریر کردہ یہ فردنامہ قمر اعظم ہاشمی کے شخصی، ادبی اور تحریکی تعارف میں ایک معتبر دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

—اسلم جاوداں

प्रकाशक
उर्दू निदेशालय
मंत्रिमंडल सचिवालय विभाग, बिहार, पटना

معمارِ دبستانِ بہار

فرد نامہ

قمر اعظم ہاشمی

انوار الحسن وسطوی

طابع وناشر:
اردو ڈائرکٹوریٹ
محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار، پٹنہ

© جملہ حقوق بحق اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار محفوظ

سلسلہ نمبر۔۲۰

Qamar Azam Hashmi

By

Anwarul Hasan Wastavi

نام کتاب	:	قمر اعظم ہاشمی
مصنف	:	انوار الحسن وسطوی
سال اشاعت	:	2022ء
کل صفحات	:	134
کمپوزنگ وتزئین	:	غیّور انور
سرورق	:	امجد حسین ڈیزائن سنٹر، پٹنہ
طابع	:	نیو فائن آرٹ آفسیٹ، درگاہ روڈ، پٹنہ۔٦

ملنے کا پتہ:
اردو ڈائرکٹوریٹ، سی. بلاک، 111، آفیسرس فلیٹ، بیلی روڈ، پٹنہ۔۸۰۰۰۰۱
فون نمبر : 0612-2530093، ای میل : directorurdu@gmail.com

فہرست

پیش لفظ	احمد محمود	4
ابتدائیہ	انوارالحسن وسطوی	6
قمراعظم ہاشمی: ایک نظر میں	—	11
قمراعظم ہاشمی: شخصیت اور سوانح	—	16
قمراعظم ہاشمی: بحیثیت استاد	—	34
قمراعظم ہاشمی: بحیثیت تنقید نگار	—	41
قمراعظم ہاشمی: بحیثیت صحافی	—	64
قمراعظم ہاشمی اور اردو تحریک	—	72
قمراعظم ہاشمی کی منتخب کتابیں: ایک مطالعہ	—	91
قمراعظم ہاشمی کی منتخب تحریریں	—	106
(الف) ''ادب اور شعور''	—	107
(ب) ''شعروادب میں طنز وظرافت کے عناصر''	—	112
(پ) ''سید شاہ مشتاق احمد: ایک شخصی تاثر''	—	116
(ت) ''سمندر پار''	—	120
(ٹ) ''آخری تحریر''	—	122
قمراعظم ہاشمی: ادیبوں اور ناقدوں کی نظر میں	—	124
کتابیات	—	133

پیش لفظ

دبستان لکھنؤ، دبستان دہلی اور دبستان دکن کی طرح اپنے مخصوص اور بیش قیمت شعری وادبی روایت اور سرمائے کی بنیاد پر دبستان بہار بھی ایک اہمیت کا حامل ہے۔

سرزمین بہار میں شعروادب کی یکتائے زمانہ اور باکمال شخصیتیں ہر دور میں ظہور پذیر ہوتی رہی ہیں اور اپنے کمالِ فن سے دنیائے ادب میں بہار کا نام روشن کرتی رہی ہیں۔

شادؔ عظیم آبادی، امداد امام اثرؔ، شوقؔ نیموی، فضلِ حق آزاد،، بیدل عظیم آبادی، انجم مانپوری، اختر اور ینوی، جمیل مظہری، سہیل عظیم آبادی، کلیم الدین احمد، قاضی عبدالودود، کلیم عاجزؔ، مظہر امام، عبدالصمد، شوکت حیات، احمد یوسف اور شفیع مشہدی جیسی بے مثل اور یکتائے زمانہ ادبی شخصیتوں نے پوری ادبی دنیا میں بہار کی شعری وادبی عظمت واہمیت کا پرچم لہرایا اور دبستان بہار کو مضبوط شناخت عطا کی۔ دبستان بہار کی شعری وادبی روایت اس قدر مقتدر اور وقیع ہے کہ دنیائے ادب اسے بڑی قدر ومنزلت کی نظر سے دیکھتی ہے اور ان کا اعتراف کرنے پر مجبور ہے۔

اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ دبستان بہار کی جملہ سرکردہ اور مقتدر ادبی شخصیتوں کی وقیع خدمات شعروادب کا اعتراف کرتا ہے۔ ان کے ادبی سرمایہ کو محفوظ رکھنے اور اسے نئی نسل تک پہنچانا اپنا نصب العین سمجھتا ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر اردو ڈائرکٹوریٹ نے گزشتہ دنوں دس مشاہیر ادب بہار ۱۔ شادؔ عظیم آبادی، ۲۔ پرویزؔ شاہدی، ۳۔ کلیم الدین احمد، ۴۔ رضا نقوی واہیؔ، ۵۔ علامہ واقفؔ عظیم آبادی، ۶۔ عبدالمغنی، ۷۔ وہاب اشرفی، ۸۔ رمزؔ عظیم آبادی، ۹۔ شین مظفر پوری، ۱۰۔ کلیم عاجزؔ کے فردنامے (مونوگراف) شائع کرائے۔ ان فردناموں کا ادبی دنیا میں زبردست استقبال کیا گیا اور اردو ڈائرکٹوریٹ کی اس پیش کش کو اہم اور قیمتی قرار دیا گیا نیز مزید مشاہر دبستان بہار پر فردنامے کی اشاعت کا مطالبہ بھی گیا ہے۔

اردو ڈائرکٹوریٹ نے دانشوران شعروادب کی ایک اہم مشاورتی نشست میں مشوروں کے بعد اتفاق رائے سے مزید ۳۲ فردناموں کی اشاعت کا فیصلہ لیا۔ جن گراں قدر ادبی شخصیتوں پر فردناموں

کی اشاعت کا فیصلہ لیا گیا ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

۱۔ امداد امام آثر، ۲۔ فضل حق آزاد عظیم آبادی، ۳۔ شوق نیموی، ۴۔ انجم مانپوری، ۵۔ یاس یگانہ چنگیزی، ۶۔ بیدل عظیم آبادی، ۷۔ قاضی عبدالودود، ۸۔ جمیل مظہری، ۹۔ اختر اورینوی، ۱۰۔ سہیل عظیم آبادی، ۱۱۔ شکیلہ اختر، ۱۲۔ حسن نعیم، ۱۳۔ غیاث احمد گدی، ۱۴۔ کلام حیدری، ۱۵۔ احمد یوسف، ۱۶۔ صدیق مجیبی، ۱۷۔ احمد جمال پاشا، ۱۸۔ اویس احمد دوراں، ۱۹۔ لطف الرحمٰن، ۲۰۔ اسرار جامعی، ۲۱۔ جمیلہ خدا بخش، ۲۲۔ رشیدۃ النساء، ۲۳۔ بیتاب صدیقی، ۲۴۔ قمر اعظم ہاشمی، ۲۵۔ راسخ عظیم آبادی، ۲۶۔ عبدالغفور شہباز، ۲۷۔ پیغام آفاقی، ۲۸۔ غلام سرور، ۲۹۔ عطاء الرحمٰن عطا کاکوی، ۳۰۔ مظہر امام، ۳۱۔ اجتبیٰ رضوی، ۳۲۔ کیف عظیم آبادی۔

پروفیسر قمر اعظم ہاشمی اردو کے ایک جیّد نقّاد، محقق اور انشاء پرداز تھے۔ اردو تحریک میں بھی ان کا کردار بہت اہم رہا ہے۔ آپ ایک دانشور اور شفیق استاد کی حیثیت سے بھی مشہور اور معروف رہے اور آپ کی خدمات زبان و ادب کے پیش نظر محکمہ راج بھاشا بہار اور بہار اردو اکادمی کے ذریعہ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اردو زبان اور اردو ادب کے لئے آپ کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔

اس فردنامے کے مصنف جناب انوار الحسن وسطوی اردو کے ایک کہنہ مشق ادیب اور مبصّر ہیں۔ تاریخی اور تنقیدی نوعیت کی آپ کی کئی کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ چونکہ انوار الحسن وسطوی بھی اردو تحریک کار رہے ہیں اور پروفیسر قمر اعظم ہاشمی سے اُن کی قربت بھی رہی۔ لہٰذا انھوں نے بڑی جانفشانی اور تحقیق کے ساتھ یہ فردنامہ قلم بند کیا ہے۔

مجھے امید ہے کہ انوار الحسن وسطوی جیسے معتبر قلم کار کے ذریعہ پیش کردہ یہ فردنامہ آپ کو ضرور پسند آئے گا۔

احمد محمود

ڈائرکٹر، اردو ڈائرکٹوریٹ

محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، پٹنہ

ابتدائیہ

پروفیسر قمر اعظم ہاشمی ایک دیدہ ور محقق، معتبر ناقد، معروف انشا پرداز، اردو شعر و ادب کے جیّد استاد، مشہور دانشور اور اردو تحریک کے صفِ اوّل کے قافلہ سالار کی حیثیت سے اردو دنیا میں جانے جاتے تھے۔ ان کی تقریباً ڈیڑھ درجن تصنیفات و تالیفات منظرِ عام پر آئیں۔ انھوں نے درجنوں قومی اور بین الاقوامی سمیناروں میں اپنے مقالے پڑھے۔ ان کے بے شمار مضامین برصغیر ہندو پاک و بنگلہ دیش کے مؤقر اردو جرائد و رسائل میں شائع ہوئے۔ وہ پچاس سے زائد ریسرچ اسکالروں کے نگراں رہے۔ صحافت نگاری کے میدان میں بھی انھوں نے اپنے جوہر دکھائے۔ ادبی جریدہ ''ساغرِ نو'' کے مدیر کی حیثیت سے رسالہ کے ''اختر اورینوی نمبر'' کا اجرا کیا۔ یہ نمبر آج بھی دستاویزی حیثیت کا ایک یادگار مجلّہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اردو کی لسانی تحریک میں انھوں نے قافلہ سالارانِ اردو الحاج غلام سرور، مولانا بیتاب صدیقی، شاہ مشتاق احمد اور پروفیسر عبدالمغنی وغیرہ کے شانہ بشانہ رہ کر اردو تحریک کو مضبوط و مستحکم کیا۔ انھوں نے انجمن ترقیِ اردو، بہار کے پلیٹ فارم سے بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنوانے کی تحریک میں اہم کردار ادا کیا۔ غرضیکہ ان کی پوری زندگی درس و تدریس، تصنیف و تالیف، طلبہ اور نئی نسل کی کردار سازی اور اردو تحریک سے وابستگی میں گزری۔ اردو کے ایسے بہت کم استاد رہے ہیں جنھوں نے زبان اور ادب دونوں کے فروغ کے لیے نمایاں کارنامہ انجام دیا ہو۔ پروفیسر قمر اعظم ہاشمی ان ہی چند جیالوں میں ایک تھے۔

پروفیسر قمر اعظم ہاشمی میرے آئیڈیل تھے۔ چنانچہ میں ان کی شخصیت سے بہت متاثر رہا ہوں۔ پروفیسر موصوف بھی مجھے عزیز رکھتے تھے، لہٰذا انھوں نے میری دو کتابوں پر اپنے تاثرات لکھ کر مجھے ممنون کیا۔ ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۵ء کو جب عابدہ ہائی اسکول، مظفر پور میں ان کی خدمات اور کارناموں پر ایک جشن کا انعقاد کیا گیا تو اس موقع سے ان کی ایما پر مجھے بھی بحیثیت مہمان مدعو کیا گیا۔ میں نے اس موقع سے ان کی لسانی خدمات کے پیش نظر ''قمر اعظم ہاشمی: بحیثیت مجاہد اردو'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پڑھا۔ راقم

السطور کی یہ تحریر ''پروفیسر قمر اعظم ہاشمی :ایک ہمہ جہت شخصیت''، مرتبہ ڈاکٹر ولی احمد ولیؔ (مطبوعہ ۲۰۰۶ء) میں شامل ہے۔ بعدۂ میں نے اپنے اس مضمون کو اپنے مجموعۂ مضامین ''رشحاتِ قلم'' (مطبوعہ ۲۰۱۱ء) میں بھی شامل کیا۔ پروفیسر ہاشمی نے میرے اس خلوص کو بنظرِ تحسین دیکھا اور مجھے اپنی دعاؤں سے نوازا۔

پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کا انتقال اردو والوں کے لیے سوہانِ روح سے کم نہ تھا۔ چنانچہ راقم السطور نے ان کی رحلت کے بعد مختلف حضرات کے ذریعہ جاری کیے گئے تعزیتی بیانات اور ان پر لکھے گئے مضامین سے اقتباسات یکجا کر کے ''اشکوں کے چھینٹے'' کے عنوان سے ایک مضمون ترتیب دیا جسے روزنامہ ''پندار'' پٹنہ نے تین قسطوں میں شائع کیا۔ پھر راقم السطور کی مذکورہ تحریر سہ ماہی ''اصنافِ ادب'' مظفر پور کے ''قمر اعظم ہاشمی نمبر'' مطبوعہ ۲۰۱۵ء میں ''پروفیسر قمر اعظم ہاشمی: کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا۔۔'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ راقم السطور نے پروفیسر موصوف کے انتقال سے متاثر ہو کر ایک اور مضمون بعنوان ''پروفیسر قمر اعظم ہاشمی: ہم تیرے ذکر سے آنکھوں کو بھگونے آئے'' بھی سپردِ قلم کیا جو سہ ماہی ''بھاشا سنگم'' پٹنہ (اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۲ء) میں شائع ہوا۔ یہ مضمون میرے مجموعۂ مضامین ''نقوشِ قلم'' (مطبوعہ ۲۰۱۵ء) میں بھی شامل ہے۔ اس طرح میں نے متعدد دفعہ پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کو اپنی تحریر کا موضوع بنانے کا شرف حاصل کیا۔

اب جب کہ اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومتِ بہار کی جانب سے پروفیسر قمر اعظم ہاشمی پر ''مونوگراف'' (فردنامہ) لکھنے کی مجھے دعوت ملی تو میں نے اسے اپنی خوش قسمتی سے تعبیر کیا۔ گرچہ میں پروفیسر ہاشمی کا شاگرد نہیں رہا ہوں لیکن انھیں اپنا معنوی استاد تصور کرتا ہوں۔ تقریباً ربع صدی تک انجمن ترقیِ اردو، بہار کے رکن مجلس عاملہ کی حیثیت سے انجمن میں ان کے ساتھ کام کرنے کا مجھے شرف حاصل رہا۔ مجھے یہ بھی فخر حاصل ہے کہ ان کی قربت مجھے نصیب رہی ہے۔

راقم السطور نے اپنے اس مونوگراف میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کے حالاتِ زندگی، ان کی سیرت و شخصیت، تعلیم و تربیت، ملازمت، تصنیفات و تالیفات، صحافتی خدمات اور اردو تحریک سے ان کی مثالی اور قلبی وابستگی کا ذکر مختصر الفاظ میں اُجاگر ہو جائے۔ اپنی اس کوشش میں کہاں تک میں کامیاب ہو سکا ہوں، اس کا فیصلہ تو قارئین ہی کریں گے۔ اس ''فردنامے'' کی تیاری

میں یقیناً کچھ کمیاں اور خامیاں رہ گئی ہوں گی، اس سے بھی مجھے انکار نہیں۔ مجھے یہ بھی احساس ہے کہ قمر اعظم ہاشمی جیسی کثیر الجہات اور جامع الصفات شخصیت پر میری یہ تصنیف محض ایک حقیر کاوش سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ چنانچہ ضرورت ہے کہ پروفیسر موصوف پر ایک مفصّل اور ضخیم تصنیف منظرِ عام پر لائی جائے تا کہ ہماری نئی نسل ان کی حیات و خدمات سے کماحقہٗ واقف ہو سکے۔

پروفیسر قمر اعظم ہاشمی پر ''فردنامے'' کی تدوین کی ذمہ داری اردو ڈائرکٹوریٹ کی جانب سے مجھے سونپی گئی۔ اس کے لیے اردو ڈائرکٹوریٹ کے ڈائرکٹر جناب احمد محمود کا شکر گزار ہوں جن کی مہربانی سے یہ سعادت میرے حصّے میں آئی۔ اس سلسلے میں میں ڈائرکٹوریٹ کے پروگرام افسر اور سہ ماہی ''بھاشا سنگم'' کے نائب مدیر ڈاکٹر اسلم جاوداں کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنھوں نے اس ''مونوگراف'' کی تیاری میں میری معاونت فرمائی۔

میرے شکریے کے مستحق پروفیسر قمر اعظم ہاشمی صاحب کے لائق و فائق صاحبزادے ڈاکٹر ارشد مسعود ہاشمی (صدر شعبۂ اردو جے۔ پی۔ یونیورسٹی، چھپرہ) بھی ہیں جنھوں نے اپنے والدِ محترم کی چند کم یاب اور نایاب کتابیں مجھے فراہم کیں۔ سچائی یہ ہے کہ اگر ڈاکٹر موصوف کا یہ تعاون مجھے حاصل نہیں ہوتا تو اس ''مونوگراف'' کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا میرے لیے مشکل ہوتا۔ کیونکہ کتابوں کی حصولیابی کا اہم مرکز ''خدابخش پبلک اورینٹل لائبریری'' پٹنہ اور ''گورنمنٹ اردو لائبریری'' پٹنہ نے وبائی مرض ''کورونا'' اور ''لاک ڈاؤن'' کے سبب قارئین کے لیے لائبریری کے اندر داخلہ ممنوع کر رکھا تھا۔ ایسی صورت میں ڈاکٹر ارشد مسعود کا تعاون میرے لیے ''ڈوبتے کو تنکے کا سہارا'' ثابت ہوا۔ ڈاکٹر ارشد مسعود صاحب کی فراہم کردہ چیزیں میرے بھانجہ عزیزی اکبر اعظم صدیقی نے مظفر پور سے لاکر مجھ تک بروقت پہنچائیں، اس کے لیے میں ان کا ممنون بھی ہوں اور ان کے لیے دعا گو بھی۔ اس سلسلے میں مرحوم ڈاکٹر مشتاق احمد مشتاق (حاجی پور) کے تعاون کا ذکر نہ کرنا بددیانتی ہوگی کہ انھوں نے پروفیسر قمر اعظم ہاشمی صاحب کے تعلق سے مختلف اخبارات و رسائل میں شائع کئی مضامین کی عکسی کاپیاں مجھے فراہم کی تھیں، جن سے میں نے استفادہ کیا۔ اللہ انھیں غریقِ رحمت کرے۔ آمین

مرحوم ڈاکٹر ممتاز احمد خاں سابق ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، بہار یونیورسٹی، مظفر پور کا بھی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر اس مونوگراف کے مسودے پر ایک نظر ڈالنے

کی زحمت گوارہ کی تھی اور مجھے اپنے مفید مشوروں سے نوازا تھا۔ اللہ انھیں اس کا بھرپور اجر دے اور انھیں جنّت نصیب کرے۔ آمین۔ میں جناب غیّور انور کا بھی ممنون ہوں جنھوں نے میرے مسودہ کی کمپوزنگ کی ذمہ داری قبول کی اور کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ میں نورچشم عزیزی ڈاکٹر عارف حسن وسطوی کا بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے اس ''فردنامے'' کی تیاری کے ہر مرحلے میں میری معاونت کی۔ میں ممنون ہوں ڈاکٹر نجیب اختر (دربھنگہ)، مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی، ڈاکٹر ریحان غنی، نسیم الدین احمد صدیقی ایڈووکیٹ اور سید مصباح الدین احمد کا جنھوں نے مجھے اس مونوگراف کی تدوین کی ذمہ داری ملنے پر اپنی خوشی کا اظہار کیا اور میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

انوارالحسن وسطوی

۲۳/اگست ۲۰۲۱ء

فردنامہ : قمر اعظم ہاشمی

قمر اعظم ہاشمی: ایک نظر میں

نام : قمر اعظم ہاشمی

والد کا نام : ڈاکٹر اعظم ہاشمی

والدہ کا نام : قمر النساء

آبائی وطن : ٹکولی، رونی سید پور، ضلع۔مظفر پور (حال ضلع۔سیتا مڑھی)

نانیہال : موضع کمن چھپرہ (داؤ دنگر) ضلع۔ویشالی

دادا کا نام : تجمل حسین

نانا کا نام : ظہور الدین

تاریخِ ولادت : ۲۰/نومبر ۱۹۴۲ء

مقامِ ولادت : باقر گنج، محلہ لہیریا سرائے، دربھنگہ

برادران : محمد علی ہاشمی، احمد علی ہاشمی، فاروق اعظم ہاشمی، نجم اعظم ہاشمی

ہمشیر : فرسانہ (زوجہ سید شاہ امان اللہ، رسول پور، لہیریا سرائے، دربھنگہ)

والدہ کا انتقال : قمر اعظم ہاشمی کی عمر جب تقریباً ۵/سال تھی (۱۹۴۷ء)

سکونت : مہدولی، دربھنگہ بعدہٗ اسلام نگر، رسول پور، نزد اللپٹی، ریلوے گمٹی، ریلوے گمٹی، لہیریا سرائے، دربھنگہ

ابتدائی تعلیم : مدرسہ احمدیہ سلفیہ، دربھنگہ

میٹرک : شفیع مسلم ہائی اسکول، لہیریا سرائے، دربھنگہ: ۱۹۵۷ء

آئی۔اے : ملّت کالج، دربھنگہ: ۱۹۵۹ء

بی۔اے آنرز (اردو) : ملّت کالج، دربھنگہ: ۱۹۶۱ء

ایم۔اے (اردو) : پٹنہ یونیورسٹی: ۱۹۶۳ء

ایم۔اے (فارسی) : پٹنہ یونیورسٹی: ۱۹۶۷ء

پی ایچ۔ڈی : پٹنہ یونیورسٹی: ۱۹۷۱ء
(موضوع: ''آغا حشر کے بعد اردو ڈرامہ'')

شادی : ہمراہ شکیلہ پروین بنت سید شاہ مسعود عالم (وکیل) اسلام نگر، رسول پور، لہیریا سرائے، دربھنگہ: ۱۹۶۵ء

والد کا انتقال : دسمبر ۱۹۶۷ء

اولاد : بیٹے
ڈاکٹر ارشد مسعود ہاشمی (صدر شعبۂ اردو جے۔پی یونیورسٹی، چھپرہ)
اطہر شاہین ہاشمی (پلاننگ انجینئر۔شارجہ)

: بیٹیاں
شہلا تسنیم عرف فہمی (اہلیہ سید ممتاز حسین)
غزالہ تسنیم عرف جذبی
(اہلیہ تنویر جمال کاظمی، سینئر لکچرر، کریم سیٹی کالج، جمشید پور)

ملازمت :

لکچرر (جز وقتی) شعبۂ اردو اے۔این کالج، پٹنہ: ۱۹۶۵ء
لکچرر شعبۂ اردو ایل۔ایس۔کالج، مظفر پور: جنوری ۱۹۷۰ء
صدر شعبۂ اردو ایل۔ایس۔کالج، مظفر پور: ۱۹۷۸ء
ریڈر، شعبۂ اردو ایل۔ایس۔کالج، مظفر پور: ۱۹۸۳ء
یونیورسٹی پروفیسر بہار یونیورسٹی، مظفر پور: ۱۹۸۶ء

پرنسپل (عارضی) : ایل۔ایس۔کالج، مظفر پور (دسمبر ۱۹۹۹ء تا جنوری ۲۰۰۰ء)

ملازمت سے سبکدوشی : ۳۰/نومبر ۲۰۰۲ء

اعزاز/ایوارڈ

- جشنِ قمر اعظم ہاشمی کا انعقاد: بمقام عابدہ ہائی اسکول، مظفر پور: ۱۱/ستمبر ۲۰۰۵ء
- بہار اردو اکادمی کا خصوصی ایوارڈ: بدست وزیر اعلیٰ بہار، بمقام کرشن میموریل ہال، پٹنہ ۲۳/فروری ۲۰۰۸ء

- ملّت کالج، دربھنگہ کی جانب سے عزّت افزائی: ۱۹رمئی ۲۰۰۸ء
- محکمہ راج بھاشا (بہار) کی جانب سے ''یحییٰ منیری ایوارڈ'': ۲۰۱۱ء

وفات : ۶راپریل ۲۰۱۲ء (بمقام رہائش گاہ، محلّہ چندوارہ مقرّی، مظفرپور)

تدفین : آم باغ قبرستان، نزد پکّی سرائے چوک، مظفرپور

تالیفات وتصنیفات

- ''فکروفن'' : ۱۹۶۳ء
- ''ساغرِنو'' (اختر اورینوی نمبر) : ۱۹۶۵ء
- ''نقش ہائے رنگ رنگ'' : ۱۹۷۱ء
- ''اردو میں ڈرامہ نگاری'' : ۱۹۷۵ء
- ''بہار کے نظم نگار شعرا'' : ۱۹۷۸ء
- ''نصاب'' : ۱۹۸۳ء
- ''عصری ادب کا شعور'' : ۱۹۸۳ء
- ''نیا نصاب'' : ۱۹۸۴ء
- ''ضحاک: ایک تنقیدی مطالعہ'' : ۱۹۸۴ء
- ''اشعارِ اکبر'' : ۱۹۸۵ء
- ''مثنوی سحرالبیان'' : ۱۹۸۵ء
- ''واردات'' : ۱۹۹۱ء
- ''ادبیات'' : ۱۹۹۱ء
- ''انتخابِ ذوق'' : ۱۹۹۲ء
- ''مضامین'' : ۱۹۹۴ء
- ''سرسری اس جہان سے گزرے'' : ۲۰۰۸ء
- ''عرب امارات کا سفری دورانیہ'' : ۲۰۱۰ء
- ''ادبی تقویمات''

(تنقیدی مضامین کا انتخاب) مرتّب: ارشد مسعود ہاشمی: ۲۰۰۸ء

- ''اختر شناسی'' (ساغرنو کے منتخب مضامین کا مجموعہ)

مرتّب : ارشد مسعود ہاشمی : ۲۰۰۸

پروفیسر قمراعظم ہاشمی پر شائع کتابیں اور رسالے :

- ''قمراعظم ہاشمی کی تنقید نگاری'' (ڈاکٹر ابوبکر رضوی) : ۲۰۰۰ء
- ''پروفیسر قمراعظم ہاشمی۔ایک ہمہ جہت شخصیت''
(مرتبہ: ڈاکٹر ولی احمد ولیؔ) : ۲۰۰۶ء
- ''آئینہ پسِ آئینہ'' (تبصرے اور محاکمے)
مرتبہ: ڈاکٹر ارشد مسعود ہاشمی : ۲۰۱۲ء
- سہ ماہی ''اصنافِ ادب'' مظفرپور (قمراعظم ہاشمی نمبر) : اکتوبر ۲۰۱۴ء تا ستمبر ۲۰۱۵ء

اعزازی عہدے:

- رکن مجلسِ عاملہ، انجمن ترقی اردو، بہار : ۱۹۷۵ء تا ۲۰۰۵ء
- نائب صدر، انجمن ترقی اردو، بہار : ۲۰۰۶ء تا ۲۰۰۷ء
- رکن، بہار اردو اکادمی، پٹنہ : ۱۹۹۰ء
- ممبر، راجہ رام موہن رائے فاؤنڈیشن، بہار (پٹنہ) : ۱۹۸۱ء
- رکن سینڈیکیٹ، جامعہ ملّیہ اسلامیہ، دہلی : ۱۹۸۸ء
- ممبر، ریسرچ کاؤنسل، بہار یونیورسٹی، مظفرپور : ۱۹۹۴ء
- سینیٹر، بہار یونیورسٹی، مظفرپور : ۱۹۹۷ء تا ۲۰۰۴ء

سمینار رسمپوزیم رورکشاپ:

بہار اور بیرونِ بہار منعقد ہوئے درجنوں سمینار اور ورکشاپ میں شریک ہوئے۔

تحقیقی مقالات:

برصغیر ہندوپاک اور بنگلہ دیش کے مؤقر اردو جرائد واخبارات میں دوسو سے زیادہ مقالات کی اشاعت۔

تحقیقی مقالوں کی نگرانی:

پچاس سے زیادہ اسکالرز کے تحقیقی مقالوں کے نگراں رہے۔

قمراعظم ہاشمی: بعدازمرگ:

- ''زبان وادب'' پٹنہ بابت اپریل ۲۰۱۲ء میں مضمون بعنوان ''قمراعظم ہاشمی اوران کی تنقیدنگاری'' از: محمد توصیف احمد کے علاوہ سوانحی خاکہ بہ عنوان ''توقیتِ قمر'' شائع ہوا۔
- ماہنامہ ''آج کل'' نئی دہلی بابت مئی ۲۰۱۲ء میں مضمون بعنوان ''مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں'' از: ڈاکٹر مشتاق احمد (پرنسپل ملّت کالج، دربھنگہ) شائع ہوا۔
- ''زبان وادب'' پٹنہ بابت مئی ۲۰۱۲ء میں ایک گوشہ بہ عنوان ''یادِ قمر'' شائع ہوا جو ۲۷؍صفحات پر مشتمل ہے۔ گوشہ میں ۹؍اہل قلم کے مضامین شامل ہیں۔
- بہار کے مشہور اخبارات ''قومی تنظیم''، ''راشٹریہ سہارا'' اور ''پندار'' وغیرہ میں بھی موصوف پر کئی مضامین شائع ہوئے۔
- روزنامہ ''قومی تنظیم'' پٹنہ کے ادبیات ایڈیشن کے انچارج ڈاکٹر منصور خوشتر نے ۱۳؍مئی ۲۰۱۲ء کو پروفیسر قمراعظم ہاشمی پر ایک گوشہ شائع کیا۔
- یکم جولائی ۲۰۱۲ء کو ''کاروانِ ادب'' حاجی پور کے زیراہتمام ''ساجدہ منزل'' باغ ملی، حاجی پور میں بیادِ پروفیسر قمراعظم ہاشمی ایک تاریخی سمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں ۸؍مقالہ نگاروں نے اپنے اپنے مقالے پیش کئے۔
- ۲؍جولائی ۲۰۱۲ء کو پٹنہ سے شائع ہونے والے مختلف اخبارات روزنامہ ''راشٹریہ سہارا''، ''پندار''، ''قومی تنظیم'' اور ''فاروقی تنظیم'' میں سمینار کی رپورٹ شائع ہوئی۔

ماہنامہ ''اردو دنیا'' نئی دہلی کے اگست ۲۰۱۲ء کے شمارہ میں بھی یہ رپورٹ نمایاں طور پر شائع ہوئی۔

❋

قمراعظم ہاشمی : شخصیت اور سوانح

''رنگ گورا۔قد تقریباً چھے فٹ۔چھریرا بدن۔بھوری مگر سوچتی آنکھیں۔کشادہ پیشانی۔تیکھے نقوش۔کلین شیو، مگر مونچھیں مردانہ وجاہت کی علامت۔وضعداری اور رواداری کے قائل۔جدید علم وادب سے آراستہ مگر مشرقی تہذیب اور مذہبی مزاج ومیلان کے حامل۔نرم گفتار اور شیریں بیان، لہجے میں خلوص واپنائیت۔چہرے پہ سنجیدگی اور شائستگی لیکن شگفتگی سے بھرپور۔اقدارِ انسانیت کے حمایتی۔پڑھنے لکھنے کا جنون۔ادبی نقطۂ نظر میں آزاد وخودمختار۔گروہی اور تنظیمی تعصّبات واثرات اور نظریاتی تحفظات سے بالاتر۔اپنے عہد کی مطلق صداقت کے مبلغ۔اظہار میں بے باکی، خودستائی اور خودنمائی خلافِ فطرت۔عاجزی وانکساری کا امتیازی وصف۔دانش وری کی روشن مثال۔شاگردوں اور طالب علموں میں بے حد مقبول ومحبوب۔لسانی تحریک کے مضبوط اور مستحکم ستون۔منفرد ناقد۔ممتاز دانشور۔معروف معلم، مقبول سماجی اور ثقافتی کارکن، کثیرالجہت شخصیت، اپنی ذات میں ایک انجمن۔ایک اسکول۔''

(''پروفیسر قمراعظم ہاشمی: ایک ہمہ جہت شخصیت'' مرتبہ: ڈاکٹر ولی احمد ولیؔ، ص۔۴۰)

یہ سراپا تھا پروفیسر قمراعظم ہاشمی کا ڈاکٹر ولی احمد ولیؔ کے الفاظ میں۔پروفیسر ہاشمی صوبۂ بہار کے ان ناقابلِ فراموش شخصیتوں میں شامل ہیں جن کی پوری زندگی اردو زبان وادب کی خدمت کے لیے وقف رہی۔زمانہ طالب علمی سے زندگی کی آخری سانس تک اردو ان کا اوڑھنا بچھونا رہی۔بحیثیت استادِ اردو، ادیب وناقد، صحافی ودانشور اور مجاہدِ تحریک اردو وہ عوام وخواص میں ہمیشہ قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھے

گئے۔قدرت نے انھیں کثیرالجہات بنایا تھا۔ان کی علمیت، دانشوری، وسیع المشربی اور روشن ضمیری کے علاوہ ان کی خدمتِ اردو کی بھی دنیا معترف ہے۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ ہزاروں طلبا و طالبات کے ذوقِ علم کو انھوں نے جلا بخشی۔اردو سے انھیں والہانہ محبت تھی۔وہ نہ صرف اردو زبان و ادب کے معروف استاد و معلم تھے بلکہ ایک سچے خادمِ اردو اور بہار کی اردو تحریک کے ایک جانباز سپاہی بھی تھے۔ بالخصوص شمالی بہار میں اردو تحریک کو انھوں نے جس خلوص، محنت اور انہماک سے مضبوطی بخشی اس کا اعتراف بہار کی اردو تحریک کے قافلہ سالار اور انجمن ترقی اردو بہار کے صدر پروفیسر عبدالمغنی نے بھی کیا:

پیدائش اور خاندانی پس منظر:

پروفیسر قمر اعظم ہاشمی ۲۰ رنومبر ۱۹۴۲ء کو باقر گنج محلّہ لہیریا سرائے، دربھنگہ میں پیدا ہوئے۔موصوف کا آبائی وطن موضع ٹکولی، رونی سید پور، ضلع مظفر پور (حال سیتا مڑھی) اور نانیہال موضع کمن چھپرہ (داؤد نگر) ضلع ویشالی ہے۔ہاشمی صاحب کے والد کا نام ڈاکٹر اعظم ہاشمی تھا جو ہومیو پیتھک ڈاکٹر کے ساتھ ساتھ جنگ آزادی کے مجاہد بھی تھے۔مسلم لیگ اور خاکسار تحریک سے ان کی وابستگی تھی۔کئی دفعہ قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلیں تھیں۔ایّام اسیری میں ہی ان کی اہلیہ قمر النساء (والدہ پروفیسر قمر اعظم ہاشمی) کا انتقال ہو گیا۔والدہ کے انتقال کے وقت قمر اعظم ہاشمی کی عمر تقریباً پانچ سال تھی۔قمر اعظم صاحب کے والد ڈاکٹر اعظم ہاشمی نہ صرف یہ کہ تہذیبِ مشرق کے دلدادہ اور اسلامی ذہن کے انسان تھے بلکہ وضع قطع اور خانگی معاملات نیز معاشرتی زندگی میں بھی مشرقیت پسندی کے علمبردار تھے۔شرعی داڑھی، شیروانی اور تُرکی ٹوپی ان کی شخصیت کا لازمی حصّہ تھیں۔صوم و صلوٰۃ کے پابند حتیٰ کہ تہجد گزار انسان تھے۔قمر اعظم ہاشمی کے دادا اجمل حسین اور نانا ظہور الدین بھی صوفیانہ مزاج رکھتے تھے اور ان پر بھی مذہبی رنگ غالب تھا۔

تعلیم:

قمر اعظم ہاشمی کی ابتدائی تعلیم مشرقی طور طریقہ پر ہوئی۔پانچ سال کی عمر میں (۱۹۴۷ء) وہ مدرسہ احمدیہ سلفیہ، لہیریا سرائے، دربھنگہ میں داخل کرائے گئے۔پھر ۱۹۵۲ء میں مسلم ہائی اسکول (اب شفیع مسلم ہائی اسکول) میں داخلہ ہوا، جہاں سے ۱۹۵۷ء میں انھوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔آگے کی تعلیم کے لیے قمر اعظم صاحب سی۔ایم۔کالج، دربھنگہ میں داخلہ لینا چاہتے تھے لیکن اپنے والد گرامی کی خواہش کا

خیال رکھتے ہوئے اقلیتی ادارہ ''ملّت کالج'' دربھنگہ میں داخلہ لیا، جہاں سے ۱۹۵۹ء میں آئی۔اے کا امتحان پاس کیا۔پھر ملّت کالج سے ہی ۱۹۶۱ء میں بی۔اے (اردو آنرز) کیا۔ملّت کالج میں گرچہ اس وقت آنرز کی تعلیم کی سہولت نہیں تھی لیکن طلبہ کے اصرار پر بہار یونیورسٹی، مظفر پور نے آنرز کے خواہاں طالب علموں کو امتحان میں شامل ہونے کی اجازت دے دی تھی۔لطف الرحمٰن (سابق صدر شعبۂ اردو تلکا مانجھی یونیورسٹی، بھاگلپور اور سابق وزیر حکومتِ بہار) بی۔اے آنرز میں قمر اعظم ہاشمی صاحب کے ہم جماعت تھے۔

قمر اعظم ہاشمی نے بی۔اے (اردو آنرز) کا امتحان پاس کرنے کے بعد اردو میں ایم۔اے کرنے کے لیے ۱۹۶۱ء میں پٹنہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور ۱۹۶۳ء میں ایم۔اے کا امتحان پاس کیا۔اس زمانہ میں اردو اور فارسی کے مضامین میں ایم۔اے کی سہولت صرف پٹنہ یونیورسٹی میں ہی تھی۔یہاں بھی لطف الرحمٰن صاحب قمر اعظم ہاشمی کے ہم جماعت تھے۔دیگر ہم جماعتوں میں ظفر اوگانوی، غنی صدیقی، علی حیدر ملک، علیم اللہ حالی، شرف الدین ملک، عظیم الدین شاکر اور عصمت آراء وغیرہ کے نام شامل ہیں۔مذکورہ ناموں میں کوئی کسی سے کم نہ تھا۔یہ سب کے سب اردو کی کسی نہ کسی صنف میں تخلیقی دلچسپی رکھتے تھے اور قلم کار کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے تھے۔اساتذہ کو بھی اپنے ان طلبہ پر فخر تھا۔پروفیسر لطف الرحمٰن لکھتے ہیں:

> ''ہمارے اساتذہ کرام علامہ جمیل مظہری، پروفیسر اختر اورینوی، پروفیسر صدرالدین فضا شمسی، پروفیسر مطیع الرحمٰن اور پروفیسر ممتاز احمد صاحب فرماتے تھے کہ پٹنہ یونیورسٹی میں ایک ساتھ اتنے ذہین و فطین طلبا کی جماعت اس سے پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔''
>
> (سہ ماہی ''اصنافِ ادب''، مظفر پور، قمر اعظم ہاشمی نمبر۔ص:۲۳)

ادبی زندگی کا آغاز:

پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کی ادبی زندگی کا آغاز بی۔اے کی تعلیم کے زمانہ میں ہی ہو چکا تھا۔بقول پروفیسر لطف الرحمٰن ''قمر اعظم ہاشمی نے گریجویشن کی مدت میں تقریباً دوسو افسانے لکھ ڈالے تھے۔وہ

منٹو سے زیادہ متاثر تھے اور نفسیات سے گہرے شغف کی بنا پر نفسیاتی کہانیاں لکھتے تھے۔ مقالہ نگاری میں بھی ان کا نفسیاتی مزاج کارفرما رہتا تھا۔'' قمراعظم ہاشمی نے اس زمانہ کی ادبی دلچسپیوں اور سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے:

> ''میری تنقید نگاری کا آغاز ہو چکا تھا۔ پہلے افسانے لکھ رہا تھا۔ سی ایم۔ کالج، دربھنگہ کے افسانوی مقابلے میں مجھے سبقت بھی ملی تھی۔ میں نے تمام افسانوں کو تلف کر دیا اور تنقید نگاری ہی پر توجہ دینے لگا۔ کئی مضامین شائع بھی ہو چکے تھے۔ لطف الرحمٰن غزل نگاری کی طرف راغب تھے اور شبیر احمد افسانے لکھ رہے تھے۔ میں انٹر ہی میں تھا کہ اختر اورینوی کی کتاب ''بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا'' اور کلیم الدین احمد کی کتابیں ''اردو شاعری پر ایک نظر'' ''اردو تنقید پر ایک نظر'' پڑھ چکا تھا۔ ''داستان امیر حمزہ'' بھی گھر میں تھی، دومرتبہ پڑھ چکا تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد، عبدالحلیم شرر، صادق سردھنوی، رئیس احمد جعفری اور ابن صفی وغیرہ ناول نگاروں کی تخلیقات بھی شوق سے پڑھتا تھا۔ میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ پسندیدہ شعرا تھے۔ ان میں میرؔ اور اقبالؔ کی شاعری زیادہ پسند تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کلام غالبؔ کی فکری گہرائیوں تک میری رسائی نہ ہو رہی ہو۔ پھر بھی غالبؔ کے دسیوں اشعار یاد تھے۔ یہ اشعار بالعموم ایسے تھے جن میں سادگی اور بے تکلفی بھی تھی اور تیز احساس بھی۔ تفکر اور تدبّر کم تھا۔ اس ادبی ذوق وشوق کی تربیت کے لیے ایم۔اے اردو کی تعلیم ضروری تھی۔''

(سرسری اس جہان سے گزرے۔ص:۱۶۔۱۷)

پٹنہ یونیورسٹی کی تعلیم کے زمانے میں قمراعظم ہاشمی کی ادبی ولسانی سرگرمیاں مزید بڑھ گئیں۔ یونیورسٹی کے اندر جب انجمن حلقۂ ''فکروفن'' کا قیام عمل میں لایا گیا تو اس تنظیم میں قمراعظم ہاشمی کو سکریٹری کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ پھر جب حلقۂ فکروفن کے ترجمان رسالہ ''فکروفن'' کی اشاعت ۱۹۶۳ء میں ہوئی تو اس کے ایڈیٹر بھی قمراعظم ہاشمی ہی بنائے گئے۔ یعنی قمراعظم ہاشمی کی صحافت نگاری کا آغاز بھی ایم۔اے کی تعلیم کے دوران ہی ہوا۔

صحافت :

جیسا کہ اوپر یہ تذکرہ آچکا ہے کہ قمراعظم ہاشمی نے ایم۔اے کی تعلیم کے زمانہ میں پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی جانب سے شائع ادبی رسالہ ''فکروفن'' کی ادارت کی ذمہ داری نبھائی تھی۔ یہ صحافت نگاری کا ان کا پہلا تجربہ تھا۔ دوسرے تجربہ کا موقع انھیں جولائی ۱۹۶۳ء میں ہی ملا جب وہ پٹنہ یونیورسٹی کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد دربھنگہ لوٹے اور وہاں پندرہ روزہ ''قومی تنظیم'' (موجودہ روزنامہ) کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی۔ قمراعظم صاحب سے پہلے ڈاکٹر نجم الہدیٰ (سابق صدر شعبۂ اردو مدراس یونیورسٹی و بہار یونیورسٹی) اسے ترتیب دے رہے تھے۔ ''قومی تنظیم'' سے اپنی وابستگی کا ذکر کرتے ہوئے قمراعظم ہاشمی نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے:

> ''دربھنگہ میں جب تک رہا قومی تنظیم کو ترتیب دیتا رہا۔ نومبر ۱۹۶۳ء میں ریزلٹ شائع ہو گیا۔ ریزلٹ کے فوراً بعد ہی میں نے پٹنہ جانے کا عزم کر لیا۔ عمر فرید صاحب سے گفتگو کے دوران میں نے اپنے ارادہ کا اظہار کیا۔ طویل گفتگو ہوئی۔ انھوں نے ہماری مشکلوں کو محسوس کر لیا اور پھر ایک فیصلہ کر لیا اور بولے! ٹھیک ہے ضرور جائیے، پٹنہ جانا ضروری ہے۔ کچھ دنوں کے اندر قومی تنظیم کو پٹنہ لے آؤں گا اور آپ ہی کو وہاں بھی اسے سنبھالنا ہے۔ میں نے اس فیصلے کا خیر مقدم کیا اور آگے کی تیاری کے لیے پٹنہ روانہ ہو گیا۔''

(سرسری اس جہان سے گزرے۔ص:۲۶)

۱۹۶۳ء کے اواخر میں دربھنگہ سے پٹنہ آجانے کے بعد غلام سرور صاحب کی ایما پر پروفیسر قمراعظم ہاشمی ''سنگم'' (ہفت روزہ) سے وابستہ ہو کر مجلس ادارت میں شامل ہو گئے۔ آگے چل کر ''سنگم'' روزنامہ ہو گیا۔ ۱۹۶۴ء اور ۱۹۶۵ء میں غلام سرور صاحب کے اسیر زنداں ہو جانے پر قمراعظم صاحب نے ''سنگم'' کی پوری ذمہ داری سنبھالی۔ انھوں نے نہایت کامیابی کے ساتھ نہ صرف اخبار کی اشاعت جاری رکھی بلکہ اس کی اسپرٹ اور مزاج کو بھی پورے طور پر برقرار رکھا۔ دوسری جانب ۱۹۶۵ء میں ہی سید عمر فرید صاحب کی گزارش پر ہاشمی صاحب نے دوبارہ ''قومی تنظیم'' کی ذمہ داری قبول کی۔ یہ اخبار اب دربھنگہ کے بجائے پٹنہ سے شائع ہونے لگا تھا۔ ہاشمی صاحب نے اپنی معاونت کے لیے اپنے

دوست لطف الرحمٰن صاحب کو اخبار کا مدیرِ اعزازی مقرر کیا اور شبیر احمد صاحب کو پریس کی ذمہ داری سپرد کی۔

۱۹۶۵ء میں ہی قمر اعظم ہاشمی نے اپنی ادارت میں ''کوہکن'' (پندرہ روزہ) جاری کیا۔اس کے اداریے بے حد جاندار اور فکر انگیز ہوا کرتے تھے۔ادبی حلقوں میں یہ اخبار اپنے ''ادبی کالم'' کے سبب بے حد مقبول تھا۔۱۹۶۹ء میں پٹنہ چھوڑتے وقت ہاشمی صاحب نے ''کوہکن'' کو اپنے دوست اور ساتھی جناب شمس الہدیٰ استھانوی کے حوالہ کر دیا۔قبل سے وہ ''ہمارا نعرہ'' (ہفت روزہ) اپنی ادارت میں نکال رہے تھے۔''قومی تنظیم''، ''سنگم'' اور ''کوہکن'' کے علاوہ ہفت روزہ ''پندار'' اور ''ندائے عوام'' سے بھی قمر اعظم ہاشمی کی وابستگی رہی۔

پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کی صحافت نگاری کا سب سے عمدہ نمونہ رسالہ ''ساغرِ نو'' کا ''اختر اورینوی'' نمبر ہے جو ۱۹۶۵ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔یہ رسالہ ۵۱۶ صفحات پر مشتمل تھا جس میں ملک بھر کے مایۂ ناز ادیبوں اور دانشوروں کی نگارشات شامل تھیں۔''ساغرِ نو'' کا یہ شمارہ ایک تاریخی دستاویز ثابت ہوا،جس کی پوری ادبی دنیا میں پذیرائی ہوئی۔جناب ہاشمی کی صحافتی خدمات کے ضمن میں رسالہ ''توازن'' دربھنگہ اور رسالہ ''ادراک'' مظفر پور کو بھی شہرت حاصل رہی ہے۔''ادراک'' کے صرف تین شمارے منظر عام پر آئے۔لیکن تین شماروں کے ذریعہ ہی اس رسالہ کی ادبی پہچان قائم ہو گئی۔رسالہ کے متوازن معیار کا تعین کرتے ہوئے پروفیسر نجم الہدیٰ نے لکھا ہے:

> ''اس میں شک نہیں کہ ادبی وسیع المشربی قمر اعظم کے مزاج کی خصوصیت ہے جس کا اعلان ''ادراک'' کے مذکورہ تینوں شماروں میں بتکرار ہوا ہے اور یہ صحیح بھی ہے کہ فن کاروں اور تنقید نگاروں کی تحریریں شائع کرنے میں کسی ادبی گروہ بندی کا ثبوت نہیں ملتا اور مختلف نظریات کے حامل اشخاص کو ''ادراک'' میں جگہ ملی ہے۔
>
> (سہ ماہی ''اصنافِ ادب''، مظفر پور۔قمر اعظم ہاشمی نمبر۔ص۔۴۱)

تحریکِ اردو سے وابستگی :

تحریکِ اردو سے بھی قمر اعظم ہاشمی کی وابستگی زمانہ طالب علمی سے رہی ہے۔۱۹۶۱ء میں جب

موصوف نے ایم۔اے (اردو) کی تعلیم کے لیے پٹنہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔اس وقت بہار میں اردو تحریک کا مرکز پٹنہ تھا جہاں ریاستی انجمن ترقی اردو، بہار کے پلیٹ فارم سے اردو کی تحریک چل رہی تھی۔اس تحریک میں الحاج غلام سرور، شاہ مشتاق احمد، مولانا بیتاب صدیقی اور پروفیسر عبد المغنی صاحبان بے حد سرگرم عمل تھے۔مولانا بیتاب صدیقی کی ہی تحریک پر ۱۹۶۳ء میں قمر اعظم ہاشمی ریاستی انجمن ترقی اردو سے وابستہ ہوئے۔یہ وہ زمانہ تھا جب انجمن کی سرگرمیوں میں حصّہ لینا ملک دشمنی کے مترادف تھا۔اس وقت اردو والوں کو ''پاکستانی'' اور اردو کو ''پاکستانی زبان'' کہا جاتا تھا،لیکن پروفیسر قمر اعظم ہاشمی ان باتوں سے ذرا بھی خائف نہیں ہوئے اور پوری ہمت اور دل جمعی سے انجمن کی سرگرمیوں میں حصّہ لینے لگے۔انجمن سے وابستگی کے بعد وہ انجمن کی ہر تحریک میں نہ صرف شامل رہے بلکہ اکثر تحریکوں کے روح رواں بھی رہے۔اردو کے تحفظ،اس کی بقا اور اس کے حقوق کی لڑائی انھوں نے تحریری اور تقریری دونوں سطحوں پر جس بے باکی اور دلیری سے لڑی وہ تحریکِ اردو کی تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے۔بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دلانے میں ان کا رول کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔سچائی یہ ہے کہ بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دلانے کی کوششوں میں ان کی قربانیاں اتنی نمایاں رہی ہیں کہ جن کے ذکر کے بغیر اردو تحریک کی تاریخ نامکمل رہے گی۔اس سلسلے میں ان کی خدمات اس قدر نمایاں اور امتیازی حیثیت کی حامل رہی ہیں کہ جن کا اعتراف اردو کے کئی قافلہ سالاروں نے کیا ہے جن میں پروفیسر عبد المغنی کا نام خصوصیت سے لیا جا سکتا ہے۔آگے کے صفحات میں پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کی تحریک اردو سے وابستگی کا مفصّل ذکر ایک الگ باب میں کیا جا رہا ہے،جس میں پروفیسر ہاشمی کی اردو خدمات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس باب کے مطالعہ سے بہار کی اردو تحریک میں پروفیسر ہاشمی کے تعاون،ان کی حصّہ داری،سربراہی اور قربانیوں کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکے گا۔

تدریسی خدمات:

پروفیسر قمر اعظم ہاشمی نے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز ۱۹۶۵ء میں اے۔این۔کالج پٹنہ سے کیا جہاں وہ عارضی لکچرر کی حیثیت سے بحال ہوئے تھے۔ان سے قبل ڈاکٹر لطف الرحمٰن یہاں صدر شعبۂ اردو کے فرائض انجام دے رہے تھے۔اے۔این کالج میں ماموری کے تقریباً دو سال بعد ۱۹۶۷ء میں جب انھیں پٹنہ یونیورسٹی میں یو جی سی کی فلیوشپ مل گئی تو انھوں نے اے۔این۔کالج کی لکچررشپ چھوڑ دی

اور پٹنہ یونیورسٹی میں اپنا ریسرچ ورک انجام دینے لگے۔ساتھ ہی ساتھ پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے بی۔اے اور ایم۔اے کے طلبا کا کلاس بھی لیتے تھے۔جنوری ۱۹۷۰ء میں اردو، فارسی کے لکچرر کی حیثیت سے قمراعظم صاحب کی تقرری بہار یونیورسٹی کے ایل۔ایس۔کالج مظفر پور میں ہوئی جہاں سبکدوشی تک لگاتار وہ اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔۱۹۷۸ء میں ہاشمی صاحب ایل۔ایس۔کالج کے صدر شعبۂ اردو کے عہدے پر فائز ہوئے، ۱۹۸۳ء میں ریڈر ہوئے اور پھر ۱۹۸۶ء میں ترقی پاکر یونیورسٹی پروفیسر بحال ہوئے۔انھوں نے کچھ برسوں تک یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں بھی تدریسی فرائض انجام دیے۔تقریباً ۳۳؍سال تدریسی فرائض انجام دینے کے بعد ۳۰؍نومبر ۲۰۰۲ء کو اپنے عہدے اور ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

قمراعظم ہاشمی صاحب اپنے طریقۂ تدریس، اخلاص ومحبت اور علم وفضل کے سبب ہمیشہ طلبہ میں مقبول رہے۔وہ کلاس روم سے باہر بھی طلبہ کے ہجوم میں گھرے رہتے تھے۔معلّمی کے پیشے کو انھوں نے محض ملازمت کے طور پر اختیار نہیں کیا تھا، بلکہ ان کی شخصیت ہی ایک درسگاہ تھی۔انھوں نے اپنی رہائش گاہ کو تربیت گاہ کی حیثیت دے رکھی تھی۔کمرہ محلّہ میں واقع ان کی رہائش گاہ کا ہال علمی وادبی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ہر دن مذاکرہ، سمینار اور ادبی محفلوں کا انعقاد طلبا کے درمیان علم وادب کی نئی روح ڈال رہا تھا۔اس ہال کے ایک گوشے میں ان کی ذاتی لائبریری تھی جو ان کے ہر طالب علم اور علم وادب کے باذوق افراد کے لیے ہمہ وقت دستیاب تھی۔قمراعظم ہاشمی نے اپنی تدریسی زندگی میں شاگردوں کی جو نسل تیار کی اور مختلف جہتوں سے اردو زبان وادب کی جو خدمات انجام دیں وہ مثالی بھی ہیں اور ناقابلِ فراموش بھی۔انھوں نے اپنے شاگردوں کی جس انداز میں تربیت اور حوصلہ افزائی کی، اس کی مثال خال خال ہی ملتی ہے۔وہ ایک مشفق استاد رہے۔پڑھنا اور پڑھانا ان کے نزدیک جنون کی حد تک شوق تھا۔ان کا یہ جنون ہی تھا کہ پچاس سے زائد اسکالروں کو انھوں نے اپنی نگرانی میں پی ایچ۔ڈی کی ڈگریاں تفویض کرائیں۔

تنقید نگاری:

پروفیسر قمراعظم ہاشمی کی اصل شناخت ایک وسیع المطالعہ ادیب اور ناقد کی حیثیت سے تھی۔پروفیسر کلیم الدین احمد اور پروفیسر اختر اورینوی کے بعد بہار کے جن ناقدوں نے تنقید کے میدان میں اپنی شناخت قائم کی ان میں قمراعظم ہاشمی کا نام بطورِ خاص اہم ہے۔قمراعظم ہاشمی نے جس زمانہ میں

تنقید نگاری شروع کی وہ ادبی نظریات کے اعتبار سے ایک ایسا دور تھا جہاں ایک طرف ترقی پسندی کے اثرات جلوہ گر تھے تو دوسری جانب جدیدیت کا دوردورہ تھا۔لیکن وہ کسی نظریے سے مرعوب نہیں ہوئے اور نہ کسی ازم سے وابستہ ہوئے۔بلکہ اپنے لیے اعتدال پسندی کی راہ منتخب کی اور اپنے اس نظریہ پر ثابت قدم رہے۔ادبی مسائل اور موضوعات پر انھوں نے ہمیشہ اپنی رائے قائم کی۔تنقید لکھنے کے ابتدائی دور میں انھوں نے ڈراما اور اردو ڈراما نگاری کو اپنی تحقیق وتنقید کا موضوع بنایا۔لیکن جلد ہی ان کی تنقیدی تحریریں موضوعاتی تنوع کی شکل اختیار کر گئیں۔چنانچہ انھوں نے شعر ونثر کی تقریباً جملہ اصناف کو اپنی تنقید کے دائرہ کار میں سمیٹ لیا۔انھوں نے ادیبوں اور ادب پاروں سے متعلق متوازن، معتدل ومعیاری رویہ اختیار کیا۔یہی سبب ہے کہ ان کی تنقید یک رُخی نہیں ہوئی اور وہ تعصب اور تنگ نظری کے بھی شکار نہیں ہوئے۔انھوں نے ادبی نظریہ میں اپنے معاصر نقادوں سے اگر کہیں اختلاف بھی کیا تو اس کا انداز مخلصانہ رہا۔انھوں نے نہایت قلیل مدت میں درجنوں تنقیدی مضامین لکھے۔''عصری ادب کا شعور''، ''بہار کے نظم نگار شعرا''، ''مضامین'' اور ''اردو ڈراما نگاری'' ان کی مشہور ومعروف تنقیدی تصانیف ہیں۔اس ضمن میں ''ضحاک: ایک تنقیدی مطالعہ'' اور ''فکر وفن'' سے بھی صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا ہے۔پروفیسر قمراعظم ہاشمی کی تنقیدی حیثیت کا اعتراف پروفیسر نجم الہدیٰ، پروفیسر کرامت علی کرامت، ڈاکٹر اخلاق اثر، احمد جمال پاشا، پروفیسر علیم اللہ حالیؔ، پروفیسر اعجاز علی ارشد، پروفیسر ارتضیٰ کریم، ظہیر ناشاد دربھنگوی اور ڈاکٹر ممتاز احمد خاں جیسے نامور ادیبوں اور ناقدین نے اپنے مضامین ومقالات میں کیا ہے۔ڈاکٹر ابوبکر رضوی کی باضابطہ ایک کتاب بنام ''ڈاکٹر قمراعظم ہاشمی کی تنقید نگاری'' بھی منظر عام پر آچکی ہے۔

مہمان نوازی:

پروفیسر قمراعظم ہاشمی مختلف لاعلاج امراض کے شکار رہے۔لہٰذا ان کی آمدنی کا ایک بڑا حصّہ ان کے علاج ومعالجہ پر خرچ ہوجاتا تھا۔اپنی معاشی تنگی کے باوجود وہ کھانے کھلانے کے بے حد شوقین تھے۔ان کے شاگرد عزیز ڈاکٹر ولی احمد ولیؔ کے بقول ''کباب'' اور ''نہاری'' ان کی مرغوب ومحبوب غذا رہی ہے۔اپنے عزیزوں، شاگردوں، دوستوں اور رفیقوں کے لیے موسم سرما میں باضابطہ اپنے گھر پر کم از کم دوتین مرتبہ ''نہاری'' کا ضرور انتظام واہتمام کرتے۔عام دنوں میں بھی وہ مہمانوں کی خاطر تواضع کرتے۔ہر ملنے جلنے والوں کو بغیر چائے پلائے اپنے پاس سے جانے نہیں دیتے تھے۔گھر میں دایہ رہنے کے باوجود ہر آنے

والوں کے لیے چائے بسکٹ وغیرہ خود لے کر باہر آتے۔ پان کھانے والوں کو پان پیش کرتے۔ پان کے وہ بے حد شوقین تھے۔ بلکہ یہ کہا جائے کہ پان ان کی زندگی کا لازمی حصّہ تھا تو غلط نہ ہوگا۔

قناعت پسندی:

قمر اعظم ہاشمی صاحب قناعت پسند انسان تھے۔ انھوں نے تمام عمر سادہ زندگی گزاری۔ زندگی میں کبھی کبھی مالی تنگی کا بھی سامنا کیا، لیکن ہر حال میں قانع رہے۔ ہمیشہ رزقِ حلال کو ترجیح دی اور اس کے حصول کے لیے سرگرم کار رہے۔ کبھی بے ایمانی اور بد دیانتی کو اپنا شعار نہیں بنایا اور ایسا کرنے والوں کی مذمت کی۔ اپنے بال بچوں کو بھی رزقِ حلال کی تاکید کرتے رہے۔ موصوف کے چھوٹے صاحبزادے اطہر شاہین ہاشمی نے اپنے والد گرامی پر لکھی اپنی تحریر میں اس تعلق سے لکھا ہے:

''جب میں نے دہلی میں نوکری شروع کی ۱۹۹۶ء میں تب انھوں نے کہا کہ بیٹے! تم جو بھی کام کرو اس میں ہنر پیدا کرو۔ حتیٰ کہ اگر گھاس بھی چھیلو تو اس میں بھی ہنر ہو۔ کوئی کام چھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا بس حلال ہونا چاہیے۔''

(سہ ماہی ''اصنافِ ادب'' مظفر پور، قمر اعظم ہاشمی نمبر۔ ص:۲۹)

اس ضمن میں قمر اعظم ہاشمی صاحب کی خود نوشت کے ان چند جملوں کو یہاں نقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں جن سے ان کی قناعت پسندی کے علاوہ ان کی خودداری اور ان کی اصول پسندی کا بھی اندازہ ہوتا ہے:

''میں نے اپنی زندگی کے احوال و آثار قلم بند کرنے کے دوران اللہ کا شکر و احسان بھی ادا کیا ہے کہ اتنی مہلت مجھے مل گئی کہ اپنے تجربے کو یکجا کر سکا۔'' میں مطمئن ہوں کہ میں نے کسی صاحبِ اقتدار کا منثور یا منظوم قصیدہ نہیں لکھا، سیاسی گلیاروں کی خاک نہیں چھانی، سیاست زدہ بنگلوں کی جبہ سائی نہیں کی، اونچے عہدے کی چاہت میں سیاسی آقاؤں کے پیر نہیں چومے، دریوزہ گری نہیں کی، دانشوری اگر سیاسی بازی گروں کی جھولی میں گر جائے تو انجام معلوم؟ مواقع بہت تھے لیکن قناعت پسندی ہی کو میں نے حرزِ جاں بنائے رکھا۔ اپنے نقصانات کی فکر کیے بغیر نئی نسل کے آزادانہ فروغ میں بھرپور تعاون دیا۔ اس کے لیے ہندوستان بھر کے

جلسوں اور سمیناروں میں شرکت بھی کرتا رہا جن کی تفصیلات قلم بند کرنے سے میں نے گریز کیا ہے۔ میرے قلم کی روشنائی کبھی سوکھی نہیں لیکن قلم کو میں نے حق و انصاف کے حصول کا وسیلہ بنایا۔ خود پروری اور کنبہ پروری نہیں کی، اسے بھیک مانگنے کے لیے استعمال نہیں کیا۔ میں ضمیر شناس تھا زر شناس نہ بن سکا۔ اس لیے زر کشیدگی کا ہنر بھی نہیں جانتا تھا۔ قلم کے تقدس کو پامال کرنے کی بے حیائی کا ارتکاب میرے بس میں نہ تھا۔ اعلیٰ تعلیم کے دروازے کو میں نے پاٹوں پاٹ کھول دیا تا کہ ایسی صف اور نسل تیار ہو جائے جو مستقبل کے چیلنج کا مقابلہ کر سکے۔ ہمارا یہ قصہ مکمل بھی ہے، ادھورا بھی۔''

(سرسری اس جہان سے گزرے۔ ص:۱۱۰۔۱۱۱)

شانِ بے نیازی:

قمر اعظم ہاشمی قلندرانہ صفت کے حامل تھے۔ چنانچہ یہ ان کی طبیعت کی قلندری ہی تھی کہ بہار یونیورسٹی کے کئی وائس چانسلر مثلاً زوار حسین، پروفیسر شکیل الرحمٰن اور پروفیسر شکیل احمد وغیرہ سے ان کے تعلقات خوشگوار رہنے کے باوجود ہاشمی صاحب نے یونیورسٹی میں کوئی اضافی اونچا عہدہ پانے کی کوئی خواہش ظاہر نہیں کی اور نہ کوئی مالی فائدہ ہی اٹھایا۔ حالانکہ مذکورہ تمام وائس چانسلر پروفیسر ہاشمی کو عزّت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ حتیٰ کہ ان کی قیام گاہ پر ان وائس چانسلروں کی آمدورفت بھی ہوا کرتی تھی۔ یہ شرف کم اساتذہ کو حاصل ہوا کہ جس کی قیام گاہ پر وائس چانسلر کی آمدورفت رہی ہو۔ اتنی قربت کے باوجود ہاشمی صاحب نے ناجائز فائدہ کی بات تو دور رہے جائز فائدہ حاصل کرنے کی بھی کبھی کوشش نہیں کی۔ قمر اعظم ہاشمی کی طبیعت کی قلندری کی دوسری بڑی مثال یہ ہے کہ ان کے ہم درس اور دوست پروفیسر لطف الرحمٰن جب بہار کے وزیر کابینہ برائے اقلیتی امور بنائے گئے تو انھوں نے اپنے دوست قمر اعظم ہاشمی کو اپنے اوپر کئے گئے احسانات کا بدلہ چکانے کے لیے بہار مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کا چیئرمین بنانا چاہا۔ لیکن ہاشمی صاحب نے یہ عہدہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جس کا انکشاف پروفیسر لطف الرحمٰن نے قمر اعظم ہاشمی پر لکھی اپنی تحریر ''قمر اعظم ہاشمی: مردانگی اور فرزانگی کا حسین امتزاج'' میں یوں کیا ہے:

''ایک بار میں نے اور محبّی منظر کاظمی مرحوم نے مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے چیئر مین کے لیے قمر اعظم ہاشمی کے نام کی تجویز رکھی اور جب بات سرکاری حلقوں میں طے ہوگئی تو قمر اعظم کو اس کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کی۔مگر قمر اعظم ہاشمی نے اس منطق کے ساتھ ہماری تجویز مسترد کردی کہ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کاجل کی کوٹھری ہے۔میرے ساتھ ہی تم دونوں کی بھی بدنامی ورسوائی یقینی ہے۔چنانچہ بات جہاں تھی وہیں رہ گئی۔''

(قمر اعظم ہاشمی: ایک ہمہ جہت شخصیت۔ص:۳۷)

مذکورہ باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قمر اعظم ہاشمی نے سرکاری منصب پانے اور امیر بننے کی کبھی کوئی خواہش نہیں رکھی اور ہمیشہ قلندری اور شانِ بے نیازی کے ساتھ جینا پسند کیا۔ان کی یہی قلندرانہ صفت انھیں ہم عصروں میں ممتاز کرتی ہے۔

حق گوئی اور بے باکی:

قمر اعظم ہاشمی اپنی حق گوئی اور بے باکی کے لیے بھی کافی مشہور رہے ہیں۔اردو یا ملّت پر کبھی کوئی افتاد پڑی تو ہاشمی صاحب کبھی خاموش نہیں رہے۔اپنی تحریر یا تقریر کے ذریعہ اپنے ردّعمل کا اظہار ضرور کرتے تھے۔ان کی موجودگی میں اگر کسی نے اردو کے خلاف کچھ بولنے کی جرأت کی تو انھوں نے کبھی یہ برداشت نہیں کیا اور مخاطب کو منھ توڑ جواب دے کر خاموش کر دیا۔ایک محفل میں اردو دشمن ایک شخص نے یہ کہہ دیا کہ ''اردو'' کو دیوناگری رسم الخط میں لکھا جانا چاہیے۔قمر اعظم صاحب نے اسے جواب دیا کہ اس سے زیادہ بہتر تو یہ ہوتا کہ اگر دیوناگری کو اردو رسم الخط میں لکھا جاتا تو اس کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو جاتا۔

پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کو ''مجاہد اردو'' تسلیم کرنے میں کبھی کسی کو انکار نہیں رہا۔ہر شخص خواہ ان کا بدخواہ ہی کیوں نہ رہا ہو، اسے انھیں ''مجاہد اردو'' تسلیم کرنے میں کوئی قباحت نہیں رہی ہے۔لیکن راقم السطور نے انھیں ایک دفعہ ''مجاہد ملّت'' کی شکل میں بھی دیکھا ہے۔۲؍اپریل ۱۹۸۹ء کی بات ہے۔انجمن اسلامیہ ہال، پٹنہ میں جناب طارق انور، صدر بہار پردیش کانگریس کمیٹی کی صدارت میں مسلم ایجوکیشنل

کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے جناب ایچ۔ایچ۔رحمٰن (وزیر حکومت بہار) نے اس موقع پر اپنی تقریر میں کہا کہ ''مسلمان جب تک قومی دھارے میں شامل نہیں ہوں گے، ان کی ترقی ممکن نہیں ہے۔'' پروفیسر قمر اعظم ہاشمی جو سامعین کی صف میں بیٹھے تھے، وزیر موصوف کی تقریر ختم ہوتے ہی فوراً اسٹیج پر چڑھ گئے اور وزیر محترم کو مخاطب کر کے بڑی بے باکی سے فرمایا کہ:

''اقلیت کہلانا ہمارے لیے فخر کی بات نہیں ہے۔ہمیں اقلیت کہہ کر سیاست دانوں نے ہمارا استحصال کیا ہے۔ہمارے مسائل ملک کے مسائل ہیں اور ان مسائل کو اقتدار میں بیٹھے لوگوں کو ہی حل کرنا ہے۔جہاں تک مسلمانوں کو قومی دھارے میں شامل ہونے کی بات ہے، تو میں یہ کہنا چاہوں گا کہ مسلمانوں کو قومی دھارے میں شامل ہونے کا مشورہ دے کر ان کی توہین کی جاتی ہے۔ہم آزاد ہندوستان میں برابر کے شہری ہیں۔ہمیں اس ملک میں اپنا کاروبار کرنے، اپنا تعلیمی ادارہ کھولنے اور حق رائے دہی جیسا اہم حق حاصل ہے۔اس طرح ہم پوری طرح قومی دھارے میں شامل ہیں۔کیا وزیر محترم مسلمانوں کو یہ مشورہ دینا چاہتے ہیں کہ ہم قشقہ کھینچ کر دیر میں بیٹھیں، تب یہ سمجھا جائے گا کہ ہندوستان کے مسلمان قومی دھارے میں شامل ہیں؟''

(رشحاتِ قلم: انوارالحسن وسطوی۔ص:۱۵۵۔۱۵۶)

پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کی زبان سے وزیر موصوف کی تقریر کا یہ برجستہ جواب سن کر پورا انجمن اسلامیہ ہال تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے گونج اٹھا۔ادھر وزیر موصوف جن کے چہرے سے ندامت جھلک رہی تھی، اپنی نشست سے اٹھ کر پروفیسر ہاشمی سے مصافحہ کیا اور ان کی اس بے باکی پر انھیں شاباشی دی۔میں نے محسوس کیا کہ ہمت اور دلیری کے مظاہرہ کے لیے جسم کا مضبوط اور صحت مند ہونا ضروری نہیں ہے۔کمزور جسم میں بھی کچھ لوگ چیتے کا جگر رکھتے ہیں۔انہیں لوگوں میں ایک نام قمر اعظم ہاشمی کا بھی ہے۔ایسی ہی شخصیتوں پر یہ شعر صادق آتا ہے:

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

مذہبیت:

پروفیسر قمر اعظم ہاشمی بظاہر اپنی وضع قطع یا چہرہ بشرہ سے مذہبی انسان نہیں لگتے تھے۔عموماً انگریزی لباس ہی زیبِ تن کیا کرتے تھے۔پوری زندگی کلین شیو رہے (زندگی کے آخری ایاّم میں ہلکی خشخشی داڑھی رکھ لی تھی) لیکن ان کا دل مسلمان تھا۔اس لیے وہ مذہبی اور دینی فکر وعمل کے انسان تھے۔ان کا خاندانی پس منظر بھی مذہبی تھا۔ان کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا جن کے بزرگوں کا تعلق ایک طرف خانقاہیت سے تھا تو دوسری طرف ان کا تعلق جماعت اسلامی سے بھی تھا۔جبکہ خود قمر اعظم ہاشمی کا تعلق تبلیغی جماعت سے تھا۔پروفیسر ہاشمی کے والد محترم ڈاکٹر اعظم ہاشمی نہ صرف یہ کہ مشرقی تہذیب کے دلدادہ تھے بلکہ وضع قطع کے اعتبار سے بھی مذہبی انسان تھے۔صوم وصلوٰۃ کے پابند ہونے کے ساتھ ساتھ تہجد گزاری اور وردووظائف بھی ان کا محبوب مشغلہ تھا۔چنانچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مذہبیت پروفیسر ہاشمی کو ورثہ میں ملی تھی۔بی۔اے کی تعلیم کے زمانے میں پروفیسر ہاشمی مراد آباد کے مولانا افتخار فریدی کی تحریک پر تبلیغی جماعت سے منسلک ہوئے اور وہ مسلسل مولانا فریدی کے رابطے میں رہے۔مولانا فریدی انھیں تبلیغی جماعت کا امیر (بہار) بنانا چاہتے تھے،لیکن ہاشمی صاحب نے اپنی جگہ پروفیسر کلیم عاجزؔ کا نام اس کے لیے پیش کیا۔لہٰذا پروفیسر ہاشمی کی تجویز پر مولانا افتخار فریدی نے پروفیسر کلیم عاجزؔ کو امیر جماعت (بہار) مقرر کیا۔تبلیغی جماعت سے منسلک ہونے کے تعلق سے قمر اعظم ہاشمی اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں:

''یہ ایک دل چسپ تجربہ تھا۔بہت سی دعائیں یاد ہوگئیں۔ہر جگہ مسجد میں قیام ہوتا تھا۔کھانا وانا بھی خود ہی تیار کرنا ہوتا تھا۔اس کے لیے اسٹوو،کراسن تیل وغیرہ ساتھ ہوتے تھے۔ایک ایسے گاؤں کی مسجد میں بھی قیام کا موقع ملا جہاں جمعہ کی نماز میں گھر پیچھے ایک شخص نماز کی ادائیگی کے لیے مسجد میں حاضری دیتا تھا۔مسلم آبادی کی جو حالتِ زار میں نے دیکھی تھی اس سے کئی ہفتوں تک ذہنی طور پر پریشان رہا۔''

(سرسری اس جہان سے گزرے۔ص:۲۷۔۲۸)

قمر اعظم ہاشمی صاحب تبلیغی جماعت سے منسلک رہنے کے باوجود جماعت اسلامی کے لٹریچر کا مطالعہ کرتے تھے اور اس جماعت کے طرزِ فکر سے متاثر تھے۔پروفیسر ہاشمی صاحب کی مذہبیت کے تعلق

سے ڈاکٹر ممتاز احمد خاں رقمطراز ہیں:

''پروفیسر موصوف انگریزی سوٹ بوٹ زیبِ تن کرنے کے باوجود پورے اور پکّے مسلمان تھے۔وہ مسلمانوں کو متحد ،سرخ رو اور سربلند دیکھنا چاہتے تھے۔مسلمانوں کو جب چوٹ لگتی تو وہ پریشان ہوجاتے تھے۔ان کا اضطراب ان کے لفظوں سے چھلکتا تھا۔ایسی خوبیوں کے مالک اور اتنی ساری صلاحیتوں کے حامل انسان روز روز پیدا نہیں ہوتے۔''

(سہ ماہی ''اصنافِ ادب'' مظفر پور،قمر اعظم ہاشمی نمبر۔ص:۴۸)

اعترافِ خدمات:

ملازمت سے سبکدوشی کے ساتھ ہی پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کی صحت تیزی سے گرتی چلی گئی۔موصوف ایاّم جوانی سے ضیق النفس (Asthama) کے شکار تھے ہی،آگے چل کر ان پر مزید امراض کا حملہ ہوتا گیا۔کبھی ٹیوبرکلوسس میں مبتلا رہے تو کبھی لیور میں خرابی رہنے لگی۔کبھی پت کی تھیلی میں پتھر ہوجانے سے پریشان رہے۔ذیابیطُس کے توپُرانے مریض تھے ہی۔چنانچہ موصوف کی بگڑتی صحت کو دیکھ کر ان کے متعدد قدیم طالب علموں اور سابق اسکالروں مثلاً ڈاکٹر ظاہر حسین شمشاد،ڈاکٹر سلیم اللہ،ڈاکٹر منظر اعجاز،ڈاکٹر خورشید انور،ڈاکٹر ولی احمد ولیؔ،ڈاکٹر محمد رئیس اور ڈاکٹر شکیل احمد معین وغیرہ لوگوں نے باہمی مشورہ سے قمر اعظم ہاشمی کی علمی،ادبی،تدریسی اور لسانی خدمات کے اعتراف میں ۱۱رستمبر۲۰۰۵ء کو مظفر پور کے عابدہ ہائی اسکول کے ''مولانا ابوالکلام آزاد ہال'' میں ایک شاندار سمینار اور مشاعرہ کا انعقاد کیا،جس میں پروفیسر عبدالمغنی،پروفیسر نجم الہدیٰ،پروفیسر عبدالواسع،پروفیسر لطف الرحمٰن،پروفیسر شاکر خلیق،پروفیسر ناز قادری،پروفیسر اسلم آزاد اور پروفیسر فاروق احمد صدیقی سمیت سرزمین بہار کی کئی علمی وادبی شخصیتوں کی شرکت ہوئی۔اس موقع پر پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کی علمی،ادبی،تدریسی اور لسانی خدمات کے تعلق سے متعدد حضرات نے مضامین پڑھے اور تقریریں کیں۔کئی منظوم سپاس نامے بھی پیش کیے گئے جسے قمر اعظم ہاشمی کے چہیتے شاگرد ڈاکٹر ولی احمد ولیؔ (مرحوم) نے یکجا کرکے کتابی صورت دی اور اسے ''پروفیسر قمر اعظم ہاشمی:ایک ہمہ جہت شخصیت'' کے عنوان سے ۲۰۰۶ء میں شائع کرایا۔یہ کتاب ۲۲۵ رصفحات پر مشتمل ہے۔

انعامات واعزازات:

پروفیسر قمر اعظم ہاشمی اپنی علمی، ادبی اور تدریسی خدمات کے عوض سرکاری سطح پر انعامات واعزازات سے نوازے گئے۔ ۲۳؍فروری ۲۰۰۸ء کو بہار اردو اکادمی، پٹنہ کے زیر اہتمام کرشن میموریل ہال، پٹنہ میں منعقدہ جلسہ ومشاعرہ کے موقع سے وزیر اعلیٰ بہار جناب نتیش کمار کے ہاتھوں اردو زبان وادب کی گراں قدر خدمات کے صلہ میں توصیفی سند اور پندرہ ہزار روپے کے نقد انعام سے نوازے گئے۔ پھر ۱۹؍مئی ۲۰۰۸ء کو ملّت کالج، دربھنگہ کے جشن زرّیں کے موقع پر کالج انتظامیہ کی جانب سے پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کی عزّت افزائی کی گئی۔ ۲۰۱۱ء میں راج بھاشا (بہار سرکار) کی جانب سے ۵۱؍ہزار روپے اور توصیفی سند سے موصوف کو نوازا گیا۔ اس اعزاز یافتگی پر اردو آبادی نے جہاں پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کو مبارکباد دی وہیں اس کے لیے راجیہ بھاشا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے ''حقدار بحق رسید'' قرار دیا۔ سچائی یہ ہے کہ پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کو ان کی زندگی میں ہی ان کی خدمات کا جس طرح اعتراف کیا گیا اور جس قدر انھیں عزّت ملی وہ ان کے ہمعصروں میں شاید ہی کسی کا مقدر بنی ہو۔

انتقال وتدفین:

پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کے آخری ایّام بھی صحت کی خرابی میں ہی گزرے۔ ذیابیطُس اور ضیق النفس کے تو وہ پُرانے مریض تھے ہی، ان کے علاوہ کچھ دیگر امراض کا غلبہ بھی ان کی صحت کو متاثر کرتا رہا۔ خون میں ''ہیموگلوبن'' کی مقدار اکثر کم ہو جایا کرتی تھی۔ آگے چل کر افزائش خون میں رکاوٹ بھی پیدا ہونے لگی، جس کے سبب وہ دن بدن لاغر ونحیف ہوتے چلے گئے۔ بالآخر ۵۔۶؍اپریل ۲۰۱۲ء کی درمیانی شب میں زندگی کی جنگ ہار گئے اور اپنے نئے مکان واقع محلّہ چندوارہ مقرّی، مظفر پور میں داعیٔ اجل کو لبّیک کہہ دیا۔ موصوف کی نماز جنازہ ۶؍اپریل ۲۰۱۲ء بروز جمعہ بعد نماز عصر مدرسہ اسلامیہ جامع العلوم چندوارہ، مظفر پور کے وسیع وعریض صحن میں ادا کی گئی۔ جس میں مختلف شعبۂ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے تقریباً ایک ہزار افراد نے شرکت کی۔ نماز جنازہ کی امامت معروف عالم دین حضرت مولانا اشتیاق عالم صاحب استاذ جامع العلوم، مظفر پور نے فرمائی۔ بعدہٗ پکّی سرائے چوک، مظفر پور سے متصل آم باغ قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ پروفیسر منظر اعجاز کے مطابق انھوں نے مظفر پور میں اتنی

بھیڑ پہلے کبھی کسی نماز جنازہ میں نہیں دیکھی تھی۔

ذکرِ قمر اعظم ہاشمی، بعد از مرگ:

پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کی وفات پر تعزیتی نشستوں کا طویل سلسلہ رہا۔ پٹنہ سے شائع ہونے والے تقریباً تمام اردو روزناموں میں اساتذہ، ادبا، شعرا اور دانشوروں کے تعزیتی بیانات مسلسل شائع ہوئے۔ ان تعزیتی بیانات کو راقم السطور نے ''اشکوں کے چھینٹے'' کے عنوان سے ترتیب دیا جسے روزنامہ ''پندار'' پٹنہ نے تین قسطوں میں شائع کیا۔ تعزیتی بیانات کے علاوہ پروفیسر ہاشمی پر تاثراتی اور علمی مضامین بھی یہاں کے اخبارات ورسائل میں شائع ہوئے۔ کئی اخبارات میں پروفیسر ہاشمی پر اداریے بھی تحریر کیے گئے۔ اخبارات ورسائل میں شائع بیانات اور مضامین کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ پروفیسر قمر اعظم ہاشمی عوام وخواص میں کتنے مقبول تھے اور لوگوں کی نگاہ میں ان کی کتنی عزّت ومقبولیت تھی۔

بہار اردو اکادمی کے ترجمان ماہنامہ ''زبان وادب'' پٹنہ نے مئی ۲۰۱۲ء کے شمارہ میں پروفیسر ہاشمی پر ایک گوشہ بہ عنوان ''یادِ قمر'' شائع کیا جس میں پروفیسر شکیل الرحمٰن، پروفیسر محمود نہسوی، حسن احمد، ڈاکٹر منظر اعجاز، ڈاکٹر سید حسن عباس، ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، ڈاکٹر حسن رضا، ڈاکٹر نجمہ احمد اور ڈاکٹر محمد ضیاء الدین کی تحریریں شامل تھیں۔ روزنامہ ''قومی تنظیم'' پٹنہ کے ادبیات ایڈیشن انچارج وجواں سال صحافی ڈاکٹر منصور خوشتر نے ۱۳؍مئی ۲۰۱۲ء کو ''شخصیات'' عنوان کے تحت قمر اعظم ہاشمی پر ایک گوشہ شائع کیا، جس میں پروفیسر نجم الہدیٰ اور ڈاکٹر ولی احمد ولیؔ کے مضامین کے علاوہ پروفیسر عبدالمغنی اور پروفیسر شکیل الرحمٰن کے تاثرات بھی شاملِ اشاعت کیے گئے تھے۔ اس صفحہ پر ڈاکٹر محمد سلیم اللہ کا تیار کردہ سوانحی خاکہ بھی شامل تھا۔ اس سے قبل روزنامہ ''قومی تنظیم'' پٹنہ میں ڈاکٹر مشتاق احمد، پروفیسر محمود نہسوی اور عارف حسن وسطوی کی تحریریں بیاد قمر اعظم ہاشمی شائع ہوئیں۔ ڈاکٹر مشتاق احمد کی تحریر بہ عنوان ''مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم'' ماہنامہ ''آج کل'' دہلی میں بھی شائع ہوئی۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کی تحریر بعنوان ''قمر اعظم ہاشمی: چند تاثرات'' روزنامہ ''پندار'' پٹنہ میں شائع ہوئی۔ اسی زمانہ میں ڈاکٹر ثریّا جہاں کا پروفیسر قمر اعظم ہاشمی سے لیا گیا انٹرویو بھی روزنامہ ''فاروقی تنظیم'' پٹنہ اور روزنامہ ''پندار'' پٹنہ میں شائع ہوا۔ یکم جولائی ۲۰۱۲ء کو ''کاروانِ ادب'' حاجی پور کے زیر اہتمام پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کی خدمات کے اعتراف میں بمقام ''ساجدہ

منزل‘‘ باغ ملی، حاجی پور ایک شاندار سمینار کا انعقاد ہوا جس میں ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، ڈاکٹر منظر اعجاز، ڈاکٹر سید حسن عباس، ڈاکٹر بدر محمدی، ڈاکٹر مشتاق احمد مشتاق، ڈاکٹر ثریا جہاں، ڈاکٹر نصرت جہاں اور عارف حسن وسطوی نے مقالے پڑھے۔ اس سمینار کی صدارت پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کے ہم جماعت معروف ادیب وشاعر پروفیسر علیم اللہ حالی نے فرمائی اور مہمانانِ اعزازی کی حیثیت سے پروفیسر ثوبان فاروقی (حاجی پور)، پروفیسر اسلم آزاد (پٹنہ)، پروفیسر توقیر عالم (مظفر پور)، ڈاکٹر نجیب اختر (دربھنگہ)، ڈاکٹر ریحان غنی (پٹنہ)، ڈاکٹر ارشد مسعود ہاشمی (صاحبزادہ پروفیسر قمر اعظم ہاشمی) اور ڈاکٹر واحد نظیر (نئی دہلی) شریک ہوئے۔ سمینار کے دوسرے دن ۲/جولائی ۲۰۱۲ء کو پٹنہ کے متعدد اخبارات میں سمینار کی رپورٹ شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ ماہنامہ ’’اردو دنیا‘‘ نئی دہلی کے اگست ۲۰۱۲ء کے شمارہ میں بھی یہ رپورٹ نمایاں طور پر شائع ہوئی۔ پروفیسر قمر اعظم ہاشمی پر یہ پہلا اور اب تک کی تاریخ کا آخری سمینار ہے جو ’’کاروانِ ادب‘‘ حاجی پور کے زیرِ اہتمام منعقد ہوا تھا۔ امید ہے کہ پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کی وقیع خدمات کے پیشِ نظر انھیں آئندہ بھی یاد کیا جاتا رہے گا۔

قمر اعظم ہاشمی: بحیثیت استاد

پروفیسر قمر اعظم ہاشمی بہار کے مشہور و معروف علمی شخصیت تھے۔ اردو کے استاد کی حیثیت سے ان کی شہرت و مقبولیت ایسی تھی جیسی ان سے پہلے پروفیسر اختر اورینوی اور پروفیسر اختر قادری کی تھی۔ سچائی یہ ہے کہ ان کے جیسی شہرت اور مقبولیت ان کے معاصرین میں سے کسی کے حصّے میں نہیں آئی۔ بحیثیت استاد اپنے طلبا اور نئی نسل کی تعلیم و تربیت میں انھوں نے جتنی دلچسپی، دلجمعی، سلیقہ مندی اور ہنرمندی کا مظاہرہ کیا اس کی مثالیں اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔ وہ نہ صرف اردو زبان و ادب کے درس و تدریس میں سرگرم عمل رہے بلکہ اردو ادب کو خود بھی خوب سمجھا اور اپنے طلبا کو بھی خوب سمجھایا۔ افہام و تفہیم کا یہ کام انھوں نے کلاس روم تک ہی نہیں کیا بلکہ اس ضمن میں مضامین تحریر کر کے اخبارات و رسائل اور کتابوں کے توسط سے انہیں قارئین تک بھی پہنچایا۔ انھوں نے طلبا کی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر بعض ایسی کتابیں تصنیف کیں جن کی ضرورت اردو کے ہر طالب علم کو محسوس ہوتی ہے۔ ان میں ’’ادبیات‘‘، ’’نصاب‘‘ اور ’’نیا نصاب‘‘ کے نام اہم ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ ’’اشعارِ اکبر‘‘، ’’انتخابِ ذوق‘‘، ’’مثنوی سحر البیان‘‘ اور ’’واردات‘‘ کی ترتیب و اشاعت (مع مقدمہ) کا کام بھی انھوں نے طلبا کی ضرورتوں کے پیشِ نظر ہی کیا تھا۔

پروفیسر قمر اعظم ہاشمی اردو میں ایم۔ اے (۱۹۶۳ء) کرنے کے دو سال بعد اے۔ این۔ کالج، پٹنہ میں عارضی لکچرر کی حیثیت سے شعبۂ اردو کے استاد مقرر ہوئے۔ اس وقت یہ کالج منظور شدہ (Affiliated) تھا۔ ان سے پہلے ڈاکٹر لطف الرحمٰن صاحب صدر شعبۂ اردو کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ان کے بھاگلپور چلے جانے کے بعد نہ صرف یہ عہدہ خالی ہو گیا تھا بلکہ اردو درس و تدریس کا سلسلہ بند ہو گیا تھا۔ قمر اعظم صاحب کی تقرری ہونے پر طلبا میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، شعبہ کے طلبا نے گرمجوشی سے ان کا

استقبال کیا۔طلبا ہاشمی صاحب کے طریقۂ تدریس اوران کے اخلاق واطوار سے نہ صرف متاثر ہوئے بلکہ ان کے گرویدہ ہوگئے۔بقول پروفیسر محمود نہسوی (جواس زمانے میں اے۔این۔کالج میں آئی۔اے کے طالب علم تھے) ''طلباان کی آواز سننے کے لیے بےتاب رہتے تھے۔''

اے۔این۔کالج میں ماموری کے تقریباً دوسال بعد ۱۹۶۷ء میں جب پٹنہ یونیوسٹی میں ہاشمی صاحب کو یو۔جی۔سی کی فیلوشپ مل گئی تو انھوں نے اے۔این۔کالج کی عارضی لکچررشپ چھوڑ دی،اور پٹنہ یونیورسٹی میں اپنا تحقیقی کام شروع کیا۔اس زمانے میں قمراعظم ہاشمی شعبۂ اردو کے اردو آنرز اورایم۔اے کے طلبا کے کلاسز لیتے تھے۔یہاں بھی وہ اپنے طریقۂ درس اوراپنے عمدہ اخلاق وعادات اوراپنے اعلیٰ علم وفضل کے سبب طلبا میں کافی مقبول رہے۔اس زمانے کے ان کے عزیز شاگردوں میں ایک اہم نام پروفیسر اسلم آزاد (سابق صدرشعبۂ اردو،پٹنہ یونیورسٹی) کا بھی ہے۔۱۹۶۸ء میں اپنے کلاس لینے کے ایک واقعہ کاذکر پروفیسر قمراعظم ہاشمی نے اپنی خودنوشت میں یوں کیا ہے:

> ''میں کلاس ختم کر چکا تھا۔اختر اورینوی صاحب آئے اوراپنے چیمبر میں داخل ہوگئے۔چند ہی لمحوں کے بعد میں داخل ہوا۔علیک سلیک کے بعد ٹیبل کے گردکی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔کچھ ہی دیر میں طلبا سبق کے لیے چیمبر میں داخل ہوگئے۔میں واپس ہونے لگا تو انھوں نے روک دیا۔خود پہلو کی آرام کرسی پر چلے گئے اوراپنی کرسی میرے حوالے کردی،فرمایا کلاس لے لو۔میرے لیے یہ آزمائش بھی تھی اورعزّت افزائی بھی۔ہچک چندلمحوں تک رہی' پھر میں نے درس دیناشروع کیا اور بھول گیا کہ پہلو میں استادمحترم بھی ہیں۔کلاس کے بعدانھوں نے میری ہمت افزائی کی،دعائیں دیں اور میں اپنی اس کامیابی پراعتماد سے بھر گیا۔
>
> (سرسری اس جہان سے گذرے۔ص:۴۳)

اس واقعہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پروفیسر قمراعظم ہاشمی کا طریقۂ درس کتنا عمدہ تھا کہ ان کے استاد پروفیسر اختر اورینوی جوخود مشہور زمانہ استاد تھے ان سے خوش ہوئے۔اپنی دعاؤں سے نوازا اوران کی حوصلہ افزائی کی۔جنوری ۱۹۷۰ء میں قمراعظم ہاشمی صاحب کی تقرری بہار یونیورسٹی،مظفرپور سے ملحق ایل۔ایس۔کالج میں اردو،فارسی کے لکچرر کی حیثیت سے ہوئی۔ایک سال بعد ۱۹۷۱ء میں کمیشن کے

ذریعہ اس تقرری کومستقل حیثیت حاصل ہوگئی۔۱۹۷۸ء میں ہاشمی صاحب ایل۔ایس۔کالج کے صدر شعبۂ اردو کے عہدے پر فائز ہوئے۔۱۹۸۳ء میں ریڈر اور ۱۹۸۶ء میں یونیورسٹی پروفیسر مامور ہوئے۔۱۹۸۶ء میں ہی بہار یونیورسٹی کے شعبۂ اردو (پی۔جی۔ڈپارٹمنٹ) میں ان کا تبادلہ ہوگیا۔چند برسوں بعد پھر ایل۔ایس۔کالج واپس چلے گئے اور وہاں صدرشعبۂ اردو (پی۔جی۔ڈپارٹمنٹ) کی ذمہ داری دوبارہ سنبھال لی۔۳۰؍نومبر ۲۰۰۲ء تک وہ اس عہدہ پر فائز رہ کر یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔اس طرح تقریباً ۳۳؍برسوں تک انھوں نے نہ صرف درس وتدریس کے فرائض بحسن وخوبی انجام دیے بلکہ اپنے علم کی روشنی سے بےشمار تشنگانِ علم کو سیراب کیا،کتنوں کے گھروں میں چراغ جلائے اور کتنے کے دامنِ آرزو کوگلِ مراد سے بھردیا۔انھوں نے اپنی انتھک محنت سے طالب علموں کی ایک ایسی فوج کھڑی کی جس کی مثال خال خال ہی ملے گی۔ان کے شاگردوں میں بعض اتنے ذی علم اورصاحب صلاحیت ہوئے کہ جس کے نتیجے میں وہ اعلیٰ مناصب حاصل کیے۔ان کے شاگردو میں بعض شاعر،ادیب،ناقد،انشاپرداز اورمحقق ہوئے جن پر ہاشمی صاحب کوزندگی بھرناز رہا۔

پروفیسر قمراعظم ہاشمی نے معلّمی کے پیشے کومحض ملازمت کے طور پراختیار نہیں کیا تھا۔بلکہ ان کی شخصیت ہی ایک درسگاہ تھی۔وہ ضیق النفس کے کہنہ مریض ہونے کے ساتھ ساتھ بہت دنوں تک گردے،پھیپھڑے اورگال براڈر کے مریض بھی رہے۔مگران شدید عارضوں کے باوجود اپنی تدریسی ذمہ داریوں سے نہ کبھی غافل رہے اورنہ اس میں تساہلی برتی۔وہ جاڑا،گرمی اوربرسات میں موسم کی شدت کے باوجود وقت پر پوری مستعدی اورتندہی سے کلاس لیتے دیکھے جاتے تھے۔جولوگ قمراعظم ہاشمی کو جانتے تھے وہ ان کی محنت،لگن اورایمانداری سے بخوبی واقف تھے اوراس معاملہ میں ان کے مداح تھے۔ان کے ساتھ ایسی آزمائش کا وقت بھی آیا کہ اکثر انھیں پورے ڈپارٹمنٹ کا بوجھ تنہا اُٹھانا پڑا۔کیونکہ انھیں کچھ ایسے ساتھی بھی ملے جو بقول شخصے ''معذور'' تھے۔چنانچہ فرسٹ ایئر سے لے کرایم۔اے تک کے تمام مضامین انھیں تنہا پڑھانے پڑے۔یہ کتنا مشکل کام ہے اس کا اندازہ وہی کرسکتا ہے جو فرض شناس استادرہا ہے۔قمراعظم ہاشمی نے اپنے اس پیشے کواپنی ذمہ داری سے بھی بڑھ کرنبھایا۔ایسی مثالیں بہت کم ملیں گی۔

قمراعظم ہاشمی کلاس سے سڑک تک اردوزبان وادب کے معلم اورمبلغ تھے۔ان کا دروازہ ہر وقت طالب علموں،اسکالروں کے ساتھ ساتھ اردو کے صحافیوں اورادیبوں کے لیے بھی کھُلا رہتا تھا۔وہ

اپنے تمام شاگردوں کے لیے دل میں ہمدردی کا جذبہ رکھتے تھے۔ان کی نظریں ہمیشہ نئی نسل کے مستقبل سنوارنے پر رہیں۔یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی زندگی میں طلبا کے ساتھ ساتھ نوجوان اساتذہ کی ذہنی تربیت میں بھی نمایاں طور پر حصّہ لیتے رہے۔وہ ہر وقت طلبا کے ہجوم میں گھرے ہوئے نظر آتے تھے۔ہاشمی صاحب کے ایک عزیز شاگرد نامور ادیب، ناقد اور محقق ڈاکٹر منظر اعجاز نے اپنی تحریر ''نذرِ قمر اعظم ہاشمی'' میں طلبا کے ساتھ ہاشمی صاحب کی شفقت، ہمدردی اور ان کی رہنمائی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''ہاشمی صاحب ہر جگہ اور ہر وقت استاد ہی تھے۔کالج سے یونیورسٹی تک اور بازار سے گھر تک یعنی کوئی بھی طالب علم بلا تامل کہیں بھی ان سے استفادہ کرسکتا تھا۔سہ پہر سے شام تک بلکہ رات کے ابتدائی حصّہ تک سارا وقت بطور خاص انھوں نے اسی کے لیے وقف کر رکھا تھا۔تشنگانِ علم وادب بالخصوص اولڈ اینڈ نیو بوائز (Old and New Boys) حسب معمول ہر دن جمع ہوجاتے اور ہر روز ورک شاپ، سمپوزیم اور سمیناروں کا سا ماحول پیدا ہوجاتا۔مذاکرے اور مباحثے چلتے رہتے۔حد تو یہ ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے اسکولی بچوں کی بھی کئی انجمنوں سے وابستہ تھے اور ان کی تقریبات میں شریک ہوتے اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے رہتے۔چنانچہ ابتدائی درجے سے انتہا درجے کے طلبا تک کے وہ استاد تھے۔اور اس وجہ سے طلبا کے علاوہ گارجین حضرات تک کی آنکھوں کے تارا بنے ہوئے تھے۔اچھے سے اچھے اور معذور سے معذور طلبا میں ان کی شہرت ومقبولیت عام تھی۔ملازمت سے سبکدوشی کے بعد بھی ان کی شہرت ومقبولیت اور عزّت واحترام میں کسی طرح کی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔''

(پروفیسر قمر اعظم ہاشمی: ایک ہمہ جہت شخصیت۔مرتبہ۔ڈاکٹر ولی احمد ولیؔ۔ص:۱۱۰۔۱۱۱)

قمر اعظم ہاشمی اپنے شاگردو کے تئیں ہمیشہ بے حد مخلص، معاون اور ان کے بہتر اور شاندار مستقبل کے متمنی رہے۔انھوں نے اپنے طالب علموں کے درمیان کسی قسم کی کوئی تفریق روا نہیں رکھی۔وہ ہمیشہ اپنے طالب علموں کے ساتھ مروّت ومہربانی سے پیش آتے رہے۔انھوں نے ہمیشہ تشنگانِ علم وادب کے لیے اپنے گھر کا دروازہ کھولے رکھا اور انھیں فیض پہنچاتے رہے۔ ان کے ایک عزیز اور لائق

شاگرد ڈاکٹر ولی احمد ولیؔ (مرتب۔پروفیسر قمر اعظم ہاشمی: ایک ہمہ جہت شخصیت) نے اپنے استاد گرامی کی اس عادت خاصّہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''علم وادب کا ادنیٰ سے ادنیٰ سائل بھی ان کے دروازہ سے مایوس ومحروم نہیں لوٹا بلکہ اپنے بقدر ظرف جھولی بھر کر گیا۔میں نے اب تک علم وادب کا ایسا ''حاتم'' نہیں دیکھا۔ورنہ میرے تجربہ اور مشاہدہ میں بعض ایسے اساتذہ آئے ہیں جن کی علمیت اور دانشورانہ ذہانت مسلم! لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ان کے علم وفضل اور دانشوری سے فی زمانہ کوئی فیضیاب نہ ہوسکا۔ان میں سے بعض تو علم وفضل کا خزانہ اپنے سینے میں چھپائے ہوئے اس دار فانی سے کوچ بھی کر گئے اور بعض بقید حیات ہوتے ہوئے بھی بے حد ریزرو واقع ہوئے ہیں۔''

(ایضاً۔ص۔۱۲۲)

پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کی خواہش یہی رہی کہ شاگردوں کی ایک ایسی جماعت تیار کردی جائے جو اردو ادب کے مختلف میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دے۔اگر سب نہیں تو کچھ ایسے شاگرد انھوں نے ضرور تیار کردیے جو آسمانِ ادب کے چاند تارے بن کر علم کی روشنی سے جہانِ ادب کے گوشے کو منوّر کررہے ہیں۔سچائی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے شاگردوں کی تربیت اور حوصلہ افزائی کے لیے اپنے عمر عزیز کا پورا وقت وقف کر رکھا تھا۔یہی سبب ہے کہ طالب علموں کے درمیان فی زمانہ جتنی شہرت ومقبولیت انھیں ملی، شاید ہی کسی دوسرے استاد کو نصیب ہوئی ہو۔نامور ادیب، ناقد اور استاد ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے قمر اعظم ہاشمی صاحب کی شخصیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے بجا تحریر فرمایا ہے:

> ''قمر اعظم ہاشمی صاحب کی یاد آتے ہی اردو کے ایک بہت عالم فاضل محنتی اور مثالی معلم کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔لکچراری، پروفیسری یا ماسٹری تو بہت سے لوگ کرتے ہیں، لیکن قمر اعظم ہاشمی صاحب نے جس طرح اردو کی تعلیم وتدریس کا فریضہ انجام دیا وہ اپنی جگہ پر ایک مثال بن گیا۔قمر اعظم صاحب صرف کلاس روم کے استاد نہ تھے۔وہ ہر جگہ اردو زبان وادب اور تہذیب کے معلّم ومبلغ تھے۔ان کا دروازہ اردو کے طالب علموں، اسکالروں، صحافیوں شاعروں، ادیبوں اور اساتذہ

کے لیے ہروقت کھلا رہتا تھا۔لوگ اپنے مسائل لے کر آتے تھے اور پروفیسر قمراعظم ہاشمی صاحب بڑی آسانی سے مشکل سے مشکل مسئلے کو حل کردیتے تھے۔اردو کا ایسا عاشق ،ایسا معلّم ،ایسا مبلغ اب کوئی نظر نہیں آتا۔ایک مثالی معلّم کی حیثیت سے ان کی عزت وشہرت نہ صرف شہر مظفر پور میں تھی بلکہ پوری ریاست بہار میں تھی اوراس سے باہر بھی۔''

(ماہنامہ'زبان وادب'پٹنہ، گوشہ۔قمراعظم ہاشمی۔ص:۴۵)

قمراعظم ہاشمی صاحب کو اپنے طلبا سے ایسی بے پناہ محبت تھی جس کی مثال خال خال ہی ملے گی۔ان کا دل اپنے طلبا کے لیے محبتوں کا سمندر تھا۔طلبا کے ساتھ وقت گزارنا پروفیسر ہاشمی صاحب کے روزانہ کے معمول میں شامل تھا۔یہ سلسلہ ان کی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد بھی جاری رہا۔سبکدوشی کے بعد دھیرے دھیرے ان کے یہاں شاگردوں کی آمد کا سلسلہ کم ہوتا گیا۔پھر بھی ہاشمی صاحب حسب معمول اپنے ہال کا دروازہ شام چار بجے کھولتے اور آٹھ بجے شب تک کھولے رہتے۔اس سلسلہ میں ایک دن کے واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ہاشمی صاحب کے چھوٹے صاحبزادے اطہر شاہین ہاشمی (عرفی) نے اپنی تحریر ''میرے ابّی: میرے استاذ'' میں لکھا ہے:

''ایک بار ابّی ایسے ہی معمول کے مطابق دروازہ کھول کر باہر بیٹھے تھے کہ اچانک زور سے رونے لگے۔عبّاس چچا(پڑوسی) فوراً آئے کہ کیا ہوا سر؟ابّی نے بتایا کہ بچوں کی یاد آگئی ہے۔ان کے بچے صرف ہم ہی نہیں تھے بلکہ ان کے سارے شاگرد تھے۔''

(سہ ماہی'اصنافِ ادب'مظفر پور۔قمراعظم ہاشمی نمبر۔ص۳۰)

قمراعظم ہاشمی کی ساری زندگی علمی وادبی خدمات سے عبارت ہے۔تمام عمر انھوں نے صرف علم وادب کا کاروبار کیا۔انھوں نے اپنی پوری زندگی ایک معلم اور ایک ادیب کی حیثیت سے گزاری۔پڑھنا اور پڑھانا ان کا جنون کی حد تک شوق رہا۔ان کا یہ جنون ہی تھا کہ انھوں نے اپنی نگرانی میں پچاس سے بھی زیادہ اسکالرس کو پی ایچ۔ڈی کی ڈگریاں تفویض کروائیں۔اردو کے ادیبوں میں بہت کم ادیب ایسے گذرے ہوں گے جنھوں نے زبان وادب دونوں کے لیے اپنی زندگی کے قیمتی اوقات وقف کیے

ہوں۔اپنی انہی خدمات کے بنا پر موصوف بہار کے ایک مایۂ ناز اور محنتی استاد کی حیثیت سے ہمیشہ مشہور ومعروف رہے۔معروف دانشور اور ماہر تعلیم ڈاکٹر ابوذر کمال الدین کے اس خیال سے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں کہ:

''قمراعظم ہاشمی کو اردو کا عوامی استاد قرار دیا جاسکتا ہے۔جس نے اردو کو کلاس روم سے نکال کر سماج تک پہنچایا ہے۔اردو زبان کو زندگی اور توانائی عطا کرنے میں قمراعظم ہاشمی کی خدمات کے اعتراف کے طور پر ان کو ''اردو رتن'' یا ''جواہرِ اردو'' کا خطاب دیا جانا چاہیے۔''

(پروفیسر قمراعظم ہاشمی: ایک ہمہ جہت شخصیت۔مرتبہ۔ڈاکٹر ولی احمد ولی۔ص:۱۰۵)

قمرِاعظم ہاشمی: بحیثیت تنقید نگار

پروفیسر قمراعظم ہاشمی کا شمار اردو کے اہم تنقید نگاروں میں ہوتا ہے۔ پروفیسر ہاشمی کے تنقیدی مضامین گراں قدر سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اردو ادب کے طالب علموں کے لیے ان کی تحریریں آئینہ کی حثیت رکھتی ہیں، جن کے مطالعہ سے فکر ونظر کو ایک بلندی حاصل ہونا لازمی ہے۔ تنقیدی شعور کو پروان چڑھانے اور فن پارے کے مطالعہ وتجزیہ میں پروفیسر ہاشمی کے تاثرات معاون ومددگار ثابت ہوتے ہیں۔ پروفیسر ہاشمی کی تنقید نگاری یک رُخی نہیں ہے۔ انھوں نے دنیا کے اچھے فن پاروں کا بالاستعیاب مطالعہ کیا تھا۔ اردو، فارسی، عربی کے ساتھ انگریزی زبان وادب کے مطالعہ نے ان کی تحریروں میں تنوّع پیدا کیا۔ معیار واقدار اور اعتدال وتوازن کا بہترین نمونہ قمراعظم کی تنقید نگاری میں جلوہ گر ہے۔ یہی سبب ہے کہ قمراعظم کو پڑھتے ہوئے ان کے متعلق اچھی رائے قائم ہوتی ہے۔

قمراعظم ہاشمی نے اردو تنقید کے تین اہم ادوار ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے عروج وزوال کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھا۔ تینوں ادوار کے فنکاروں، ادیبوں اور دانشوروں کو پڑھا، ان کے خیالات ونظریات کا ناقدانہ تجزیہ کیا اور ادبی محاذ پر ان سے مکالمے کیے۔ لیکن نہ تو وہ کسی ازم سے مرعوب ہوئے اور نہ کسی ازم کی راہ پر گامزن ہوئے۔ قمراعظم ہاشمی صاف ستھری ادبی بصیرت، اعلیٰ فکری صلاحیت، تجزیہ نگاری کا عمدہ سلیقہ اور نپا تلا لہجہ لے کر اردو تنقید کے میدان میں وارد ہوئے اور تاحیات انھوں نے یہ انداز اپنائے رکھا۔ قمراعظم نے صحرائے تنقید میں اپنا قبلہ نہیں بدلا۔ اپنے تنقیدی موقف کی وضاحت قمراعظم نے ان الفاظ میں کی ہے:

> ’’میں کسی نقطۂ نظر کی فارمولائی تحدید وپابندی کو غیر مستحسن تصور کرتا رہا ہوں۔ میرے نزدیک ان اقدار انسانیت کی پاسداری بھی کافی ہے جن سے زندگی

> کے مثبت، صالح اور تعمیری تصورات نشو ونما پاتے ہیں۔ ایسا ادبی نظریہ جو پارٹی پروگرام کو سامنے رکھ کر وضع کیا گیا ہو اور کسی نہ کسی اعتبار سے ’’عظیم طاقتوں‘‘ سے وفادارانہ الحاق سے متعلق سازشوں کی پرورش کر رہا ہو میرے لیے ناپسندیدہ اور غیر مستحسن ہے۔ انسانیت سوزی کے خوفناک اور خونیں ڈرامے، کابل میں ہوں یا بیروت میں، تہران میں ہوں یا تبت میں، سب یکساں طور پر نفرت ومذمت کے لائق ہیں۔ ادب کا موضوع انسانیت ہے اور انسانیت کی اربعہ جغرافیائی پیمانے میں مقرر نہیں کی جاسکتیں۔ اسے کسی مذہبی یا سیاسی مسلک کے حوالے کر کے سبکدوشی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ کسی رنگ یا نسل، فرقے یا طبقے کی یہ جاگیر بھی نہیں ہے۔ سیاسی یا تحریکی اور جماعتی وابستگی ادیبوں کو خانوں اور پیمانوں میں منقسم کر دیتی ہے۔ اس کے نتیجے میں ان کی سالم اور مکمل شخصیت بکھر جاتی ہے۔ محدود نظریاتی وابستگی سے متعلق وفاداریوں کی ادائیگی کے دوران انسانی معاشرے کی حق تلفی ناگزیر ہے۔ اس نوعیت کی نظریاتی عینک کے سرخ، زرد یا سبز شیشے کی مناسبت سے ادیب اپنے گردوبیش کے حالات کو دیکھتا، نتائج اخذ کرتا ان کو ادبی پیرائے میں بیان کرتا ہے۔ نقطۂ نظر کی پرزور بالادستی کبھی کبھی اسے دونوں آنکھوں کو کھلا رکھنے سے بھی روک دیتی ہے۔ تیسری آنکھ یعنی چشم باطن کی بے بسی کا کیا کہنا؟ نظریاتی تعصب کے اس انداز کو میں ادب اور اس کے مرکزی موضوع یعنی انسانیت، دونوں ہی کے لیے مہلک تصور کرتا ہوں۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ میں نقطۂ نظر کی اہمیت اور افادیت کا قائل نہیں ہوں۔ صالح اقدار انسانیت کی غیر مشروط تسلیمی ہی بنیادی طور پر اہمیت رکھتی ہے۔ فن وادب کی ترقی وترویج کا انحصار بھی اسی پر ہے اور انسانی معاشرے کو سرمایۂ سکون وسرور فراہم کرنے کا وسیلہ بھی یہی ہے۔ بشرطیکہ نقطۂ نظر کے شیشے سفید اور شفاف ہوں۔
>
> (’’عصری ادب کا شعور‘‘۔ قمراعظم ہاشمی: ص۔۵۔۷)

اپنے تنقیدی افکار ونظریات کو اتنے واضح اور مدلل الفاظ میں وہی ناقد بیان کر سکتا ہے جس کی

تنقید نگاری کے شیشے پر عصبیت کی گرد نہ جمی ہو۔اس کا ظاہر و باطن صاف وشفاف ہو۔وہ آزادانہ فکر کا حامل ہو۔اس کی فکر پر کسی کی پہرہ داری نہ ہو۔اسی موقف کو اور آگے بڑھاتے ہوئے قمر اعظم ہاشمی لکھتے ہیں:

"اب بھی کہ جب پرانے معاشرتی نظام کی تمام دیواریں منہدم ہو چکی ہیں، نئے معاشرے کے ڈھانچے کے خطوط سامنے نہیں آسکے ہیں۔ہم ملبے کے پاس تھکے تھکے سے کچھ ڈھونڈ رہے ہیں!!؟ گم شدہ اقدارِ حیات کی روشنی؟ اقدارِ نو کی بصیرت؟ مسرّتِ ماضی؟ یا محفوظ و مطمئن مستقبل کا تصوّر؟ یہی اضطراب آمیز جستجو، تخلیقی فکر و بصریت کو جلا بخشتی ہے۔میرے نزدیک اسی لیے قصۂ جدید وقدیم سے بالاتر ادب کی عصری بصیرت اور عصری قوت ہے۔اسی سے ادب وفن میں اصل کشش اور توانائی پیدا ہوتی ہے۔یہ عصری بصیرت مفقود ہو تو اونچے سے اونچا آدرش اعلیٰ سے اعلیٰ نصب العین اور افضل سے افضل ادبی نظریہ بھی معیاری اور حیات آفریں تخلیقی نمونے پیش نہیں کر سکتے۔'آدرش کا تعین' متعلقہ دور کی انفرادی اور اجتماعی، شخصی اور معاشرتی آویزشوں، سرگرمیوں اور تبدیلیوں کی بنیاد پر مختلف انداز میں ہوتا ہے۔چونکہ سماجی زندگی نت نئے نشیب وفراز سے گذرتی ہے ،اس لیے عصری ادب میں متفرق رجحانات ومیلانات کا پایا جانا فطری ہے۔ایسی صورت میں خیر وشر اور انصاف وناانصافی کے مابین امتیاز کرنا ہی انسانی قدروں کے حفظ وبقا کا اشاریہ ہے۔نور وظلمت کی کشاکش جاری ہو تو ایسے میں غیر جانبداری کا ڈھونگ رچا کر راہِ فرار اختیار کرنا انسان کے شایانِ شان نہیں اور ادیب کے لیے تو قرین قیاس بھی نہیں۔"

("عصری ادب کا شعور"۔قمر اعظم ہاشمی:ص۔۷۔۸)

ان دو اقتباسات کو پڑھ کر قمر اعظم ہاشمی کا تنقیدی موقف واضح ہو جاتا ہے۔آدمیت، احترامِ آدمیت، انسانیت، اعلیٰ اخلاقی قدریں قمر اعظم ہاشمی کے نزدیک مقدم ہیں۔وہ خیر وشر، حق وباطل، انصاف وناانصافی، نور وظلمت کے درمیان واضح فرق دیکھنا چاہتے ہیں۔خلط ملط انھیں بالکل پسند نہیں اور ادب کو تو وہ انسانیت کا ترجمان قرار دیتے ہیں۔ظلم وجبر، تشدد، خوں ریزی اور سفا کی دنیا کے جس خطہ میں ہو وہ مذموم

حرکت قمر اعظم ہاشمی کے نزدیک انتہائی قابل مذمت ہے۔اور ایک ادیب وفنکار کی یہ اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے واقعات کی پُر زور مخالفت کرے اور قلم کے ذریعہ اپنا احتجاج درج کرائے۔ایک فنکار کے لیے راہِ فرار کسی بھی طور پر جائز نہیں۔اگر سماج و معاشرے کے سلگتے مسائل اس کی نظروں سے اوجھل ہیں یا فنکار قصداً منھ موڑ رہا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے فرض منصبی سے انصاف نہیں کر رہا ہے۔قمر اعظم ایک فنکار کے اندر عصری بصیرت کو پہلے تلاش کرتے ہیں۔ان کا ماننا ہے کہ ادب کے نظریہ جدید ہوں کہ قدیم اگر عصری حسّیت سے عاری ہیں تو فنکار کا ادب پارہ شاہکار اور اپنے وقت کا ترجمان نہیں ہو سکتا۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اعلی درجے کی تنقید کے جو عناصر ترکیبی بیان کیے ہیں وہ اس طرح ہیں: ادبیات سے شغف، کثرت مطالعہ، غور وفکر، کافی تجربہ، ذوق سلیم، وسعت نظر، قوت فیصلہ اور قدرت بیان۔عبدالحق لکھتے ہیں:

"تنقید صرف وہی لکھ سکتا اور دوسروں کو ہدایت کر سکتا ہے جس کا تجربہ وسیع، مطالعہ گہرا اور نظر دور بیں ہو، جو صرف ذوق ہی صحیح نہ رکھتا ہو بلکہ دریائے ادبیات کا شناور بھی ہو، جس نے ایک مدت مطالعہ اور غور وفکر کے بعد ان امور کے متعلق خاص رائے قائم کی ہے اور وہ اس رائے کے بیان کرنے کی قدرت رکھتا ہے اور دوسروں کے دل نشیں کر سکتا ہے۔"

(روح تنقید، تنقیدات۔عبدالحق، مرتبہ۔محمد تراب علی باز،ص: ۹۹)

جیّد نقاد پروفیسر عبدالمغنی تنقید اور تنقید نگاری کے متعلق لکھتے ہیں:

"شعور وآگہی تنقید کی پہلی شرط ہے۔ایک صاحب فکر اور باذوق انسان ہی ادبی نمونوں کی تشریح اور ان کی قدر و قیمت کا تعین کر سکتا ہے۔اگر ناقد کے کچھ اپنے تصورات نہ ہوں تو وہ کسی پارۂ ادب کی کیفیات سے زیادہ سے زیادہ باز آفرینی کر سکتا ہے۔لیکن یہ تبصرہ ہو تو ہو، وہ بھی معمولی قسم کا تنقید نہیں ہوگی۔تنقید ادبی تجربے کی توضیح کے ساتھ ساتھ اس کا تخمینہ بھی لگاتی ہے۔اس کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالتی ہے اور تاریخ ادب میں اس کا درجہ متعین کرتی ہے۔"

("تصورات"۔عبدالمغنی ص: ۷)

تنقید اور اصول تنقید سے متعلق پروفیسر ہاشمی کے ہمعصر اور نابغۂ روزگار ادیب و دانشور پروفیسر ڈاکٹر نجم الہدیٰ اپنی تصنیف ''فنِ تنقید اور تنقیدی مضامین'' میں اس تعلق سے لکھتے ہیں:

''تنقید کا پہلا متفقہ اصول ادب و فن کو سمجھنا اور سمجھانا ہے، تا کہ اس کی قدر و قیمت کا تعین ہو سکے، دوسرا متفقہ اصول زیر بحث فنی کارناموں کے حقائق سے مکمل آگاہی اور دیگر متعلقہ علوم و فنون سے بقدر ضرورت شناسائی، تاکہ تنقید میں وزن اور وقار پیدا ہو، تیسرا اور آخری مرحلہ قدر و قیمت کا فیصلہ اور تعین مراتب ہے۔'' ۱۱

(''فن تنقید اور تنقیدی مضامین''۔ نجم الہدیٰ، ص: ۲۱۔۲۲)

اردو کے قدیم و جدید ناقدین کی اس رائے کے بعد خود قمر اعظم ہاشمی کی تنقید سے متعلق رائے جان لینا ضروری ہے تاکہ اسی تناظر میں خود ان کی تنقید نگاری کا جائزہ لیا جا سکے۔ تنقید نگاری کے اصول کے متعلق قمر اعظم ہاشمی اپنے ایک تنقیدی مقالہ ''پروفیسر احتشام حسین کا اسلوب تنقید'' میں لکھتے ہیں:

''تنقید کی زبان میں قطعیت، لوچ اور شفافیت (Transparency) ہوتی ہے۔ شریعت اور عمومیت نہیں ہوتی۔ مجموعی طور پر تنقیدی تحریر میں فکری استدلال، خیال کا فطری ارتقا اور موضوع کا عقلی محاکمہ ضروری ہے۔ جذبات پر قابو اور مفاہیم کی ادائیگی کے وسیلے پر دسترس بھی ہونی چاہیے۔ ضروری نہیں کہ یہ اسلوبِ تنقید ایک ہی طرح سے سب کو متوجہ اور متاثر کرے۔ تنقید نگار کی شخصیت اگر اس اسلوب میں پہچان لی جاتی ہے تو اس کی انفرادیت مسلم ہے۔''

(''ادبی تقویمات'' مرتبہ۔ ڈاکٹر ارشد مسعود ہاشمی۔ ص۔ ۳۶۶)

مندرجہ بالا ماہرین ادب کی رائے کی روشنی میں پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کے تنقیدی نگارشات کے مطالعے کے بعد ان کے متعلق مثبت رائے قائم ہوتی ہے۔ ایک ذمہ دار اور بالغ نظر تنقید نگار کی حیثیت سے قمر اعظم ہاشمی نے اپنی شناخت قائم کی۔ اپنے افکار و نظریات اور ادبی موقف کو کسی تحریک کے ہاتھوں گروی رکھ کر یک رُخی نہیں ہوئے بلکہ موضوعات کے انتخاب کے ساتھ فکر کی سطح تک ایک معیار کو برقرار رکھا۔ پروفیسر ہاشمی کی نظری تنقید اور عملی تنقید کا سرمایہ کیفیت کے اعتبار سے کم ضرور ہے لیکن اہمیت کے اعتبار سے مسلّم ہے۔ نظری تنقید اور عملی تنقید دونوں محاذ پر قمر اعظم ہاشمی نئی نسل کی رہنمائی کرتے ہیں اور انھیں

عمدہ ادب پارے کی تخلیق کی جانب متوجہ کرتے ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ قمر اعظم ادب میں نظریہ کے قائل نہیں ہے جیسا کہ انھوں نے خود لکھا بھی ہے۔ وہ تمام ادبی نظریوں اور رجحانوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ جدید و قدیم کی تفریق سے بالاتر ہو کر وہ ایک کھلے ذہن کے ساتھ ادب کے اُفق پر نمودار ہونے والے ادب پاروں کا تجزیہ کرتے ہیں۔ ان کا ذہن کسی خاص ادبی موقف کے کھونٹے سے ہرگز بندھا ہوا نہیں ہے۔ وہ ایک صاف و شفاف فضا میں ادب کا مطالعہ اپنی فکر و نظر کی بنیاد پر کرتے ہیں۔ جہاں کہیں جو چیز انھیں متاثر کرتی ہے اس کی پذیرائی کرتے ہیں اور جو چیز ان کے معیار نقد کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتی اسے خارج کرتے ہیں۔ قمر اعظم کے اس تنقیدی موقف کو اعتدال پسندی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ وہ ادبی موضوعات، ادبی افکار و نظریات اور ادبی فن پاروں کے مطالعہ، تجزیہ اور ان کے قدر تعین میں انتہا پسندی کے شکار نہیں ہوتے ہیں، بلکہ ایک سنجیدہ اور ذمہ دار تنقید نگار کا حق ادا کرتے ہوئے کھرے کھوٹے کا فرق واضح کرتے ہیں۔

قمر اعظم ہاشمی کی عملی و نظری تنقید کا دائرہ وسیع ہے۔ ادب کی مقبول عام تمام صنفوں پر انھوں نے تجزیے اور تبصرے کے توسط سے اپنی رائے قائم کی ہے اور متعدد ادبا و شعرا کے فن پاروں کا دوٹوک مطالعہ پیش کیا ہے۔ نثر ہو کہ شاعری، ڈرامہ ہو کہ افسانہ نگاری، مرثیہ ہو کہ رباعی گوئی، ادبی افق پر نمودار ہونے والی تحریکیں ہوں کہ ادبی رجحانات قمر اعظم ہاشمی نے ایک ذمہ دار اور باشعور ناقد کی حیثیت سے اپنے حصّہ کا کام ایمانداری کے ساتھ پورا کیا ہے۔ ان کی تحریریں پڑھنے والوں کے علم میں اضافہ کرتی ہیں۔ ان کے سوچنے کے انداز پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ نیز تجزیہ، تنقید اور تبصرے کی صلاحیت میں اضافہ کرتی ہیں۔

قمر اعظم کی دو مستقل تنقیدی کتابیں ''عصری ادب کا شعور'' اور ''مضامین'' اور پھر آگے چل کر ان کے منتخب تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''ادبی تقویمات'' ایسے مقالات کا مجموعہ ہیں جن میں شعر و ادب کے مسلمات اور اصول و نظریات سے کھل کر بحث کی گئی ہے۔ ان مضامین میں تجزیے اور تبصرے دونوں کی شمولیت سے کئی اہم مسائل پر سیر حاصل گفتگو کے نتیجے میں بعض اہم گوشے روشن ہوئے ہیں۔

قمر اعظم کی نظری تنقید کا وسیع تر مشاہدہ ان کے اہم ترین ادبی مضامین ''عصری ادب کا شعور''، ''عصری مسائمت''، ''معیاری ادبی نثر''، ''فنکار اور اسٹیبلشمنٹ''، ''ادب اور شعور''، ''نیا ادب اور ذات کی تلاش''، ''اردو ادب کی رفتار ترقی''، ''افسانے کی عصری حسیّت''، ''نظم اور عصری نظم نگاری''، ''نظم

آزاد۔آج کل‘‘،’’ادب اوررومانیت‘‘،’’ڈراما نگاری کا فن‘‘،’’اسٹیج اورڈراما‘‘،’’اردو تنقید کی موجودہ روش‘‘،’’تنقید کی تخلیقی حیثیت‘‘،مرثیہ بطوررزمیہ‘‘’’اردوتنقید نگاری ۔کل اورآج‘‘وغیرہ میں کیا جاسکتا ہے۔ان مقالات میں قمراعظم ہاشمی نے اپنے تنقیدی مزاج کا برملا اظہار کیا ہے اورفن وادب کے مختلف پہلوؤں پرتنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔

فن کاراورقاری کے باہمی رشتے کی بات ہی اگرکی جائے تو ہرادب پارے کے لیے اپنے قاری کومتوجہ اورمتاثر کرناایک بڑاچیلنج ہوتا ہے۔دوسری جانب قاری کے لیے یہ راستہ دشوارگزار ہوتا ہے کہ وہ فن پارے کے ادبی محاسن کو فنکار کےنظریے اوراس کی ذہنی اُپج کے عین مطابق اپنی ذات میں ڈھالنے میں کامیاب ہو۔قمراعظم ہاشمی نے اس نازک صورتحال کا جائزہ لیتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے۔

’’فنکار کی محدودشخصیت عام انسان کی طرح معاشرتی نشیب وفراز میں ہچکولے کھاتی رہتی ہے۔اس لیےتخلیقِ فن کی تمام داخلی گذرگاہوں میں اس کاابدی انسانی مزاج سائے کی طرح اس کے ساتھ لگا رہتا ہے۔یہی وہ اہم ترین رُخ ہےجس کی وجہ سے فنکار کا تخلیقی اورنجی کارنامہ دوسروں کے لیے بھی بامعنی،کشش انگیز اورپُراثر بن جاتا ہےاورغیرفنکاراپنے اپنے ظرف ومزاج کے اعتبار سے اپنی اپنی پسند اورفطری مطالبوں کے مطابق تخلیقی کارنامے میں معانی ومفاہیم تلاش کرتے،محظوظ ہوتے اوراپنے ذہنی وجذباتی خلاؤں کوروشن کرتے ہیں۔قاریوں کی اس دریافت سے فنکاریا ادیب بالکل غیرمتعلق ہوتا ہے اوربے نیاز ۔محسوسات کی سطح پرخودفنکار کی شخصیت ہی اس کے قاری اورمحاسب کے فرض انجام دیتی رہتی ہے۔تخلیق کے کسی مرحلے میں وہ کسی اورکی مداخلت گوارانہیں کرتا ۔اسے اپنے’’میں‘‘کے جبلی تقاضوں کی تسکین مطلوب ہے۔قاریوں کے تفہیمی معیار اورجذباتی وذہنی سطح کوملحوظ رکھے توتخلیق کے ہرقدم پر اسے غیرضروری رکاوٹوں اورغیرتخلیقی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے۔فریب تسکین کے دھندلکوں میں بھٹکتا پھرے اوراسے کسی لمحہ تخلیق کی آسودگی نصیب نہ ہو۔عام قاری کی مجبوری یہ ہے کہ وہ اپنے ذہن میں محفوظ معنوں اورحسی مطالبوں کوفن پاروں میں تلاش کرتا

ہے۔اپنے تجربہ وخیال کوفن پاروں میں سمونا چاہتا ہے۔فنکار کے تخلیقی رویہ،تجرباتی بصیرت اورحسی شعور کو اپنے اندراتار نے کی زحمت گوارانہیں کرتا۔قاری انہماک اورتوجہ کی مصیبت مول لینے کو تیار ہوتو یہی فن پارہ فنکار کی طرح اسے بھی لذت تکمیل اورنشاط تسکین فراہم کرتا ہے۔‘‘

(’’عصری ادب کاشعور‘‘قمراعظم ہاشمی۔ص۔۱۱)

فنکاراورقاری کے مابین خلاء کوپُرکرنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قمراعظم ہاشمی اپنے اس نقطۂ نظر کومزیدآگے بڑھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’فنکاریاادیب سے اپنی پسند کی تخلیقات کا مطالبہ کرنے کی جگہ ذوق مطالعہ کی تربیت کی طرف توجہ دی جائے اورتھوڑی محنت گوارا کی جائے تو مشکل آسان ہوسکتی ہے۔اس سلسلہ میں ایک ذمہ داری ادیبوں اورفنکاروں پربھی عائد ہوتی ہے کہ قاریوں سے بےتعلقی کے اعلان کی جگہ انہی قاریوں کے ذوق فہم اورشوق مطالعہ اورتخلیقی نمونوں کے درمیان حائل ہونے والے شعوری حجابات کودورکرنے کی کاوش کرنی چاہیے تاکہ نارسائیوں کےشکووں کی دیواریں بتدریج منہدم ہوسکیں۔‘‘

(’’عصری ادب کاشعور‘‘قمراعظم ہاشمی۔ص۔۱۹)

قمراعظم ہاشمی کی تحریریں عصرحاضر کے موضوعات،مطالبات،مسائل اورامکانات پر مرکوز ہیں۔وہ نئے لکھنے والوں سے بھی یہی توقع کرتے ہیں کہ عصری مسائل ومباحث کو پیش نظر رکھا جائے۔ایک فنکار کا رجحان یانظریہ چاہے جس قبیلے سے ہووہ اپنی ذات وصفات کے ساتھ ساتھ عوامی مسائل ومعاملات کا بھی ترجمان ہو۔قمراعظم ہاشمی کے خیال میں ادب میں اسلوب ایک ایسا ہتھیار ہے جس کے سہارے عمدہ قاری پیدا کیے جاسکتے ہیں اورفن پارے کو قاری کے لیے محبوب بھی بنایا جاسکتا ہے۔اسلوب کا جادوادب کو ہرخاص وعام کے درمیان مقبول عام بنانے کا بہترین ذریعہ ہے:

’’نئے ادب کی وہ امتیازی صفت اس کا اسلوب یا اسٹائل ہی ہے جس کی وجہ سے اعتراضات کی گنجائش نکلتی رہی ہے۔اسلوب میں لفظیات کا نیا شعوراورطرزِ بیان کی ندرت دونوں ہی شامل ہیں۔احساسات عصر کی صداقتوں کوتو محسوس سبھی کرتے ہیں،

البتہ ان کے اظہار کے مختلف طریقوں اور ان کی انفرادیت آمیز پیچیدگیوں سے وہ مسئلے پیدا ہوئے ہیں جن کی بنیاد پر اعتراض کیے جاتے ہیں۔ اظہار کے عصری اسالیب ان کی ضرورتوں اور پیچیدگیوں کی نقاب کشائی کرنے لگیں تو پھر قاری اور اس کے عصری ادب کے درمیان کی اجنبیت خود بخود ختم ہو جائے گی۔''

(''عصری ادب کا شعور'' قمر اعظم ہاشمی۔ص۔۲۰)

افسانوں کے تعلق سے اردو ادب میں دو نظریات کا رجحان واضح طور پر دیکھا گیا ہے۔ جدیدیت کے دور کے افسانے ترقی پسندی کے دور کے افسانوں سے یکسر مختلف ہو گئے۔ بے ماجرا کہانیوں کا ایک چلن سا عام ہو گیا۔ قصہ پن سے دور ہونے کی وجہ سے افسانے کا رشتہ قاری سے ٹوٹا گیا۔ تجریدی آرٹ کے نام پر قاری سے کھلواڑ کیا گیا۔ قصہ اور پلاٹ سے خالی افسانے ایک ایسی بھول بھلیا ہو گئے جہاں قاری کی رسائی ناممکن ہو گئی۔ قمر اعظم ہاشمی اس ادبی نوک جھونک کو ناقدانہ بصیرت کے ذریعہ ایک اعتدال کی راہ دکھاتے ہیں جہاں نئے موضوعات اور تکنیک کو بھی جگہ دی گئی ہے اور افسانے کی روح کو بھی برقرار رکھنے پر تاکیدی نشان لگایا گیا ہے۔ مضمون ''افسانے کی عصری حسیّت'' میں قمر اعظم ہاشمی لکھتے ہیں:

''موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے افسانے میں چاہے جس طرح کی تبدیلی آجائے، میرا خیال ہے کہ اس کی بنیادی صفت ''افسانویت'' یا ''کہانی پن'' کو کسی حال میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ظاہر ہے کہ کہانی کہنے اور لکھنے کے ہزاروں طریقے ہیں۔ کسی ایک صورت اور ہیئت کی مستقل وفاداری کا ہر اعلان مضحکہ خیز ہے۔ افسانوی پیرایہ میں (جس کی کوئی تخصیص نہیں) کسی خاص کیفیت کی خاص صورت حال میں موثر پیشکش ہی افسانہ نگار کی کامیابی کی دلیل ہے۔ یہی پیشکش قاری پر ایک ایسا واحد تصور ثبت کرتی ہے کہ جس کی ارتسامی لہریں احساس وخیال کے اصنام ناتراشیدہ کو قوت گویائی عطا کرتی ہیں۔ اور زندگی کی پُراسرار تلخ حقیقتوں سے حجابات کو ہٹاتی چلی جاتی ہیں۔ گویا افسانے کی مجموعی فضا جو اس کے اقتباسات کو ختم کرتی ہے اور ایک حیات کی متقاضی ہے، یہاں خود فراموشی نہیں، خود شناسی کی دعوت ہے۔ ابتدا سے انتہا تک افسانوی فضا زندگی سے کسب حرارت حاصل کرتی

رہتی ہے۔ اقتضائے حیات کا یہی شعور، فنکارانہ شعور افسانے کو عصری توانائیوں سے آراستہ کرنا چاہتا ہے۔''

(''ادبی تقویمات''۔ مرتبہ۔ ڈاکٹر ارشد مسعود ہاشمی۔ص۔۳۹۰)

ڈراما کے تعلق سے بھی اردو ادب میں طویل بحث جاری رہی۔ بیشتر ناقدین کا خیال ہے کہ ڈراما کا راست تعلق اسٹیج، تھیٹر، اداکاری اور تماشابین سے ہے۔ اسٹیج سے الگ ہٹ کر ڈرامے کا تصور ناممکن ہے۔ پروفیسر احتشام حسین کے الفاظ میں تو افسانے اور ناول لکھنے کے بعد فنکار کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے، لیکن ایک ڈراما نگار کی ذمہ داری اپنے فن کو ثابت کرنے کے لیے اسٹیج کی منتظر رہتی ہے۔ دوسری طرف پروفیسر عبدالمغنی اور ان جیسے ناقدین جو ادب میں اخلاقیات کو اوّلیت دیتے ہیں اسے ادب کی تہذیبی وراثت سے چھیڑ چھاڑ قرار دیتے ہیں۔ ایسے ناقدین کا استدلال ہے کہ افسانے اور ناول کی طرح ڈرامہ بھی اپنی جگہ ایک مکمل صنف ادب ہے اس لیے اسے اسٹیج، تھیٹر اور اداکاروں کے حوالے کر کے اس کی ادبی حیثیت کو مجروح نہ کیا جائے۔ ان دو متضاد تنقیدی نظریات کے بیچ قمر اعظم ہاشمی کی تنقیدی نگاہ میں ایک کامیاب ادبی ڈراما اسٹیج سے تعلق رکھے بغیر لکھا جاسکتا ہے، اس کی ڈرامائی اہمیت بھی ممکن ہے اور وہ قاری کے لیے دلچسپ بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن ڈرامے کا فن اپنی مجموعی شکل میں ادبی بھی ہے اور تکنیکی بھی۔ فن ڈراما عملی زیادہ ہے اور علمی کم۔ مضمون ''اسٹیج اور ڈرامہ'' میں قمر اعظم ہاشمی نے اس متعلق ایک جگہ لکھا ہے:

''اسٹیج کی کمی کے سبب ہمارے ڈرامے عملی ہونے کے بجائے علمی ہوتے چلے گئے۔ اسٹیج کی روایات اگر زندہ ہوتیں تو شاید 'ادبی ڈراما'' کی اصطلاح وضع نہ کرنی پڑتی۔ ڈراما کی پیش کش کے لیے اسٹیج واحد اور بہترین ذریعہ ہے۔ ایک کامیاب ''ادبی ڈراما'' بھی اپنی کامیابی کی تکمیل کے لیے اسٹیج کا دست نگر ہوتا ہے۔ ڈرامے کامیاب اور ناکام یا اپنے نقائص اور خوبیوں کے پیش نظر اچھے اور بُرے ہوسکتے ہیں۔ ڈرامے کے لیے ادبی اور غیر ادبی کا فرق غیر ضروری ہے۔''

(''اردو ڈرامہ نگاری'' قمر اعظم ہاشمی۔ص۔۴۳)

ادب میں تخلیق کی اوّلیت اور تنقید کی ثانویت پر بھی مباحثے ہوئے ہیں۔ ان مباحث کے بیچ یہ بات اپنی جگہ اٹل ہے کہ تنقید کی جڑیں بھی تخلیق کی بنیادوں میں پیوست ہیں۔ ناقد کی ذمہ داری ان معنوں

میں سب سے زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ وہ فنکار اور قاری کے بیچ پُل کا کام کرتا ہے۔ اگر اچھے فن پارے کو ناقد کا ساتھ نہ مل پائے تو ادبی شان پیدا نہیں ہوتی ہے۔ عہد حاضر کی تنقید کو باوزن اور معیاری بنانے کے لیے قمر اعظم ہاشمی غیر مشروط نظریہ کو ناگزیر قرار دیتے ہیں، تاکہ واقعتاً ایک ناقد، ادب میں کھرے اور کھوٹے کے فرق کو واضح کرنے کے اپنے فرض منصبی کو پورا کر سکے۔ مقالہ اردو تنقید کی موجودہ روش میں قمر اعظم ہاشمی نے اس خیال کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

> ''ادیب انسانی قدروں کی جستجو کے دوران، انسان کو پیمانوں میں تقسیم کر کے اپنے قدم آگے بڑھائے گا تو اسے ادھورے لوگ ملیں گے۔ وہ یک رُخے انسان کو موضوع بنا کر کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کے پیش نظر مکمل زندگی ہونی چاہیے جو مختلف طرح کے معاملات ومسائل اور تحریکات وتغیرات سے گذرتی رہتی ہے۔ عصر نو کی تنقید اسی تخلیقی فکر ونظر سے وابستہ ہے۔ رومانی شاعری، فلسفیانہ شاعری، نفسیاتی شاعری اور ترقی پسند شاعری کا دور تھا تو تنقید بھی کئی پیمانوں پر بٹی، اور رومانی، مقصدی، فلسفیانہ، نفسیاتی اور ترقی پسندانہ بن گئی۔ اب شاعری صرف شاعری ہے اور اس کی تنقید بھی محض تنقید۔ چنانچہ تنقید کو نظریات کی ترویج کا وسیلہ بنانے کی جگہ ادبی نمونوں کی تفہیم کا ذریعہ سمجھنے پر زور دیا جانے لگا ہے۔ سچے اور اچھے ادب کے لیے ''غیر مشروطیت'' ضروری خیال کی گئی ہے اور سچی اور اچھی تنقید کے لیے بھی ''غیر مشروط'' ہونے کو لازمی تصور کیا گیا ہے۔''
>
> (''عصری ادب کا شعور'' قمر اعظم ہاشمی۔ ص۔۵۶)

قمر اعظم ہاشمی کی عملی تنقید نگاری بھی وسیع النظری، عمیق مطالعہ، فکر وفن کے بالیدہ شعور اور تجزیہ وتبصرہ کے منطقی اور استدلالی انداز بیان کی وجہ سے مضبوط اور توانا ہے۔ موضوعات میں تنوّع، تنقید میں اعتدال، اسلوب میں برجستگی اور اظہار خیال کی بے باکی ان کی ناقدانہ حیثیت کو مسلم کرتے ہیں۔ سرسید، اقبال، آغا حشر، منٹو، احتشام حسین وغیرہ تو ان کے محبوب فنکار ہیں ہی۔ ان کے علاوہ مختلف ادبی رجحانات سے تعلق رکھنے والے بڑے فنکاروں کے فن پاروں کا دوٹوک مطالعہ پیش کر کے قمر اعظم ہاشمی نے عملی تنقید کے عمدہ نقوش چھوڑے ہیں۔ معروف اور نسبتاً کم معروف نیز ہمعصر ادیبوں اور شاعروں کے فن پاروں کا بھی

قمر اعظم ہاشمی نے منصفانہ تجزیہ کیا ہے۔ اس ضمن میں ''اقبال کی اردو نظموں کا تکنیکی سلیقہ''، ''تہذیب حاضر پر اقبال کی تنقید''، ''کلامِ اکبر اور اصلاح معاشرہ''، ''اکبر راجع یا مصلح''، ''آغا حشر کاشمیری کا عہد''، ''حشر کے بعد اردو ڈرامے''، ''احتشام حسین کا اسلوبِ تنقید''، ''راشد۔ جدید نظم کا ایک معمار''، ''خالد: ایک صاحبِ طرز تمثیل نگار''، ''فیض کی شاعری میں احتجاج کی لے''، ''فیض اور راشد''، ''منٹو کا فن''، ''ہمارا افسانہ نگار۔۔۔ بیدی''، ''کلامِ واہی میں واقعہ نگاری''، ''لندن کی ایک رات''، ''فراق کی غزلیں''، ''جمیل مظہری اور تصور خدا''، ''اجتبیٰ رضوی کی شاعری''، ''پرویز شاہدی کی نظم نگاری''، ''ڈاکٹر محمد حسن بحیثیت ڈراما نگار''، ''لطف الرحمٰن کی غزلیں''، ''ظفر حمیدی اور ان کی شاعری''، ''ظفر اوگانوی کے افسانے''، ''اقبال انصاری کے افسانے''، ''لکشمن ریکھا کے افسانے'' جیسے مضامین کا ذکر بلا تکلف کیا جا سکتا ہے۔ ان مضامین میں قمر اعظم ہاشمی نے ایک انصاف پسند ناقد کا حق ادا کیا ہے۔ چھینٹا کشی اور عیب جوئی جیسی لعنتوں سے اپنا دامن بچایا ہے۔ ایک ادیب یا شاعر ترقی پسند ہو کہ جدیدیت کا علمبردار یا پھر اسلامی فکر کا ہمنوا، قمر اعظم نے اس ادیب یا شاعر کو بحیثیت ادیب یا شاعر ہی اپنے تنقیدی موقف کے پیمانے پر پرکھا اور تولا ہے۔ اور اس کے ادبی سرمائے کے محاسن ومعائب کی نشاندہی کی ہے۔ قمر اعظم نے قدیم وجدید ادب پاروں کا مطالعہ وتجزیہ اس نہج سے کیا ہے کہ ایک نئی تاویل کا احساس ہوتا ہے۔ وہ تخلیق کار کی فکر تک رسائی کرنے کا ہنر خوب جانتے ہیں۔ وہ الفاظ کے استعمال میں محتاط ہیں۔ قطعیت اور اعتماد ان کا وصف خاص ہے۔ اختصار نویسی میں جامعیت کا ہنر کوئی قمر اعظم سے سیکھے۔ صحت مند اور صالح فکر کو انھوں نے اہتمام کے ساتھ اپنی تنقید میں جگہ دی ہے۔ اور اسی ذوق وشوق کو پروان چڑھانے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے ادبی محاذ آرائیوں، تنقیدی مسلکوں اور گروہ بندیوں سے خود کو دور رکھا۔ ان کا چشم باطن پاک وصاف اور ذہن بیدار ہے۔ وہ اصولی بحث کو فروغ دینے کے خواہاں ہیں۔ قمر اعظم عصر نو کی تنقید پر زور دیتے ہیں تاکہ ایک ناقد تنقید کے وقت مکمل زندگی کو پیش نظر رکھے۔ سماجی طبقہ بندی، معاشرتی اور تہذیبی اقدار سے سچی واقفیت ایک ناقد کو صحیح فیصلہ لینے میں معاون ومددگار ہوتے ہیں۔

قمر اعظم ہاشمی نے ہر اچھی چیز کا خیر مقدم کیا ہے اور ہر غلط نقطۂ نظر پر تاکیدی نشان لگائے ہیں۔ اگر وہ علی گڑھ تحریک اور فکر اقبال کے شیدائی وہمنوا ہیں تو اس کا برملا اظہار ان کی تحریروں میں خوبصورتی کے ساتھ جگہ پاتا ہے۔ وہ اپنے خیالات کو مستحکم اور مدلل لفظیات سے آراستہ کرتے ہیں۔ مختلف

تنقیدی مقالات سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

• ''علی گڑھ تحریک کا اردو ادب پر اثر''

''علی گڑھ تحریک نے قدیم ادبی شعور کی پرورش کی اور شعر و ادب کو ہم عصر زندگی کے معاملات و مسائل سے آشنا کر کے زیادہ بامعنی بنا دیا۔ علی گڑھ تحریک کے وسیلے سے اس واقعیت پسندانہ نقطۂ نظر نے شاعری اور نثر نگاری دونوں ہی کے فرسودہ مزاج کو توڑ دیا۔ احساس و خیال کا طلسمی ماحول ٹوٹا تو مایوسی اور اضمحلال کی کیفیتوں کی جگہ حیات آفریں آرزومندی نے لے لی اور شعر و ادب میں اس آرزومندی کی عکاسی ہوئی تو آہستہ آہستہ بیان اور موضوع بیان کا قدیم رنگ پھیکا، بے نمک، بے لطف، بے جان اور کھوکھلا معلوم ہونے لگا۔ علی گڑھ تحریک کی پرورش یافتہ نئی ادبی روایات کا حلقۂ اثر وسیع ہونے لگا اور شعر و ادب کی مختلف اصناف زندگی کے تقاضوں اور مطالبوں کی ترجمانی کرنے لگیں۔ علی گڑھ تحریک اردو کی موجودہ نثر کی بانی ہے تو اردو کی موجودہ شاعری کی بنیاد بھی اسی نے ڈالی۔ سرسید کے مقصدی نقطۂ نظر نے حالیؔ کے دل میں ملی دردمندی کی جو آنچ تیز کی تھی ''مسدس حالیؔ'' اسی کا ثمرہ ہے۔ اور دوسری طرف اقبالؔ کی شاعری میں حب الوطنی، ملت پسندی اور انسان دوستی سے متعلق جو خیالات روشن ہوئے ان پر بھی علی گڑھ تحریک کا گہرا اثر ہے۔''

(''عصری ادب کا شعور'' قمر اعظم ہاشمی۔ ص۔ ۶۵)

• ''اقبالؔ کی اردو نظموں کا تکنیکی سلیقہ''

''اقبالؔ کے تخلیقی نقطۂ نظر اور اندازِ بیان میں گہرائی اور ہمہ گیری کا پیدا ہونا ناگزیر تھا کہ یورپ کے سفر کے دوران مغربی دنیا کے حالات و حوادث دیکھ چکے تھے۔ اسلامی دنیا کے اضطراب انگیز کروٹوں سے بھی باخبر تھے۔ جنگ عظیم کی ہولناک تباہیوں کے ردِّ عمل پر بھی ان کی نگاہ تھی۔ اور اس وقت کی قومی اور بین

الاقوامی سیاسی ریشہ دوانیوں کو بھی وہ دیکھ رہے تھے۔ چنانچہ حالیؔ اور اکبرؔ کی طرح فکر و نگاہ کی محدودیت میں مبتلا رہنا ان کے لیے ممکن ہی نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ تجربہ و احساس کی وسعتوں اور رنگا رنگ کیفیتوں کے اظہار کے لیے وہ بیان کے منجمد دائرے سے باہر نکلنے پر مجبور تھے۔ معلوم و مقرر سانچوں میں شعری تجربہ و احساس کے عصری سرمائے کی پیش کش ان کے لیے ممکن العمل ہی نہ تھی۔ اقبالؔ نے اپنی تخلیقی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے بیان کی وسعتوں کی دریافت کی، چنانچہ لازمی طور پر اردو شاعری کے آہنگ و اسلوب میں تبدیلیاں برپا ہوئیں۔''

(''مضامین'' قمر اعظم ہاشمی۔ ص۔ ۸۷)

• ''فیض کی شاعری میں احتجاج کی لے''

''فیض علمی طور پر بھی ترقی پسند تھے اور نظریاتی طور پر بھی۔ اور ترقی پسند تحریک ایک انقلابی تحریک تھی جس سے منسلک تمام دانشور، ادیب اور شاعر انقلاب کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ اس ترقی پسندانہ ایوان شاعری میں صرف فیض کی شاعری ہے جہاں معاشرتی نظام کی تبدیلیوں کا تصور ایک عقیدہ بن کر نمایاں ہوا ہے۔ پوری کلاسیکی وضعداری، احتیاط، متانت، سنجیدگی اور لطافت کے ساتھ۔ یہاں دھوم دھام کی وہ کیفیت ملتی ہی نہیں جسے انقلابی شاعری کا مزاج قرار دیا گیا ہے اور شعری لہجے میں غم و غصہ کا بپھرا ہوا برہم عامیانہ انداز بھی نہیں ملتا ہے۔''

(''ادبی تقویمات'' مرتبہ۔ ڈاکٹر ارشد مسعود ہاشمی۔ ص۔ ۱۸۰)

• ''پروفیسر احتشام حسین کا اسلوب تنقید''

• ''ان (احتشام صاحب) کے اسلوب تنقید میں استدلال کا وہ رنگ ہے جو قارئین کے اندر یقین و اعتماد کا چراغ روشن کرتا ہے۔ معاشرتی بصیرت، عصری شعور، فلسفیانہ انداز نظر اور فکری گہرائی نے ان کے اسلوب کی تشکیل کی ہے جس میں فن کار کی ذہنی اور حسّی پیچیدگیوں کو سمجھنے کے لیے نفسیاتی اور جمالیاتی عناصر بھی

موجود ہیں۔احتشام صاحب کے اسلوب کا یہ کمال توازن ہے کہ دوسرے مارکسی تنقید نگاروں کی طرح وہ جذباتیت اور پروپگنڈائی ذہنیت کے شکار نہیں ہوئے،ان کی شخصیت سے ایک تازہ اسلوب تنقید طلوع ہوا۔''

(''ادبی تقویمات''مرتبہ۔ڈاکٹر ارشد مسعود ہاشمی۔ص۔۳۶۷)

• ''راشد۔جدید نظم کا معمار''

''راشد نے شاعرانہ اظہار کے لیے اپنا ایک خاص ڈکشن وضع کیا ہے۔ان کی نظموں میں فکر واحساس کا ایک جہانِ تازہ بھی ہے اور اسلوب وتکنیک کا ایک پختہ ،بالیدہ،تراشیدہ اور منظّم شعور بھی لفظیات،تلمیحات،استعارات وعلامات کی تہہ بہ تہہ معنویت اورموسیقیت نے راشد کی اس ''بے قافیہ شاعری'' کو وہ دل کشی اور توانائی بخش دی کہ موجودہ دور میں آزاد نظم نگاری کی اس ''راشدانہ روایت'' نے قبولیت عام کی سند حاصل کر لی اور اس کی وجہ سے آزاد نظم کے صنفی اور تخلیقی مزاج واسلوب کو اعتبار واستحکام حاصل ہوتا چلا گیا۔''

(''ادبی تقویمات''مرتبہ۔ڈاکٹر ارشد مسعود ہاشمی۔ص۔۲۰۹)

فراقؔ گورکھپوری کی جنس زدگی مشہور زمانہ ہے۔کئی بڑے ناقدین ادب نے فراق کی شاعری کے اس رجحان کو سامنے رکھ کر فراق کی شاعری میں پائی جانے والی فنی ریاضت ،موضوعات کی پیش کش،احساس کی شدت،قادرالکلامی،نازک خیالی ،دلکش تشبیہات واستعارات کے استعمال جیسی خوبیوں سے آنکھیں چرالیں۔قمراعظم ایسے تنقیدی رویے کی گرفت کرتے ہیں اور اسے غیر منصفانہ قرار دیتے ہیں۔مضمون ''فراقؔ کی غزلیں''میں لکھتے ہیں:

''حسن وعشق کے موضوع کو یوں تو سینکڑوں شعراتختۂ مشق بناتے رہے ہیں،لیکن ان کا حشر وہی ہوا جو شاخِ نازک پرآشیانہ بنانے والوں کا ہونا چاہیے۔فراق نے برسوں مطالعات اورمشاہدات کی دنیا کی سیر کی،تجربات کی بھٹی میں تپے،مشق ومہارت اورفنی ریاضت کی منزلوں میں سرگرداں پھرے،اورخیالات واحساسات

کی وادیوں میں بھٹکے۔تب ان پر ان کی شخصی اورانفرادی خصوصیات کا ایک خاص رنگ چڑھا۔ان کے شعوروفن میں یہ پختگی اوررچاؤ،ان کے حسن احساس میں یہ لطافت اور پاکیزگی،ان کے تجربہ ومشاہدہ میں یہ باریکی اورنکتہ آفرینی محض ان کے روح افزا اور جانگسل تجربات اور بے پناہ ریاضتوں اورمطالعوں نے عطا کی ہیں۔وہ کائنات کی ہر چیز کو اپنے مخصوص زاویۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔اوروں کے متعین کردہ میزان ومعیار سے وہ استفادہ ضرور کرتے ہیں لیکن کام میں وہ اپنے ہی میزان ومعیار کولاتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ حسن وعشق کے سلسلہ میں بھی ان کا ایک خاص اندازنظر ہے۔وہ نہ افلاطونی عشق کے قائل ہیں اور نہ ماورائی یا سماوی عشق کے۔حسن وعشق کے معاملہ میں وہ جسموں کو مرکز افعال سمجھتے ہیں۔فراق کا یہ رجحان روائتی فکر پرضرب کاری ثابت ہوا۔ہمارا عہد جھنجھلا اٹھا۔اس نئی فکر اورنئی آواز نے افراد کے کان کھڑے کردیے۔اعتراضات ہوئے،طعنے اور چوٹیں کی گئیں۔فراق کی شاعری پرجنسی آلودگیوں کے الزامات عائد کیے گئے۔۔۔اس عہد نے ردِعمل میں سب کچھ کیا لیکن فراقؔ کی شاعری کی بلندیوں اوروسعتوں پر پہرہ بھی نہ بٹھا سکا۔''

(''عصری ادب کا شعور''۔ص۔۸۳)

کچھ ایسی ہی صورتحال علامہ جمیل مظہری کے تعلق سے بھی دیکھی جاتی ہے۔جمیل مظہری کے تصورخدا کا معاملہ بھی ناقدین ادب کے درمیان ایک الجھا ہوا مسئلہ ہے۔قمراعظم اس مسئلے کے حل کے لیے وسعت قلبی دکھاتے ہیں۔قمراعظم کے پیمانۂ نقد پرجمیل مظہری خدا کے وجود کے منکر تو ہرگز نہیں ہیں لیکن شخصی اعتبار سے زندگی کی تلخیوں الجھنوں اور پریشانیوں کی وجہ سے شاعر کہیں کہیں ٹھوکریں کھا جاتا ہے۔اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس کا ذہن تصورخدا سے عاری ہے۔''جمیل مظہری کا تصّورخدا''میں قمراعظم ہاشمی نے اس نکتہ کا اظہار کیا ہے:

''تصورخدا کے معاملے میں جمیل صاحب کی سوچیں بالکل ذاتی ردعمل کی مظہر ہیں۔دانش حاضر نے انسان کی مادی ترقی اورروحانی زوال کو ایک ایسے نقطے پر

مرتکز کردیا ہے جہاں کربناک سوالوں کا ڈھیر تو ہے، داخلی خلاؤں کو متوِ رکرنے کا کوئی راستہ نہیں۔ زندگی کی عصری لہروں میں انسان کی اپنی معنویت ہی گم ہوکررہ گئی ہے اور جمیل صاحب اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ یہ گم شدہ معنویت، خدا سے کنارہ کشی اختیار کر لینے سے نہیں مل سکتی۔ اس کا قرب ہی انسان کی بے چہرگی کا علاج ہے۔ لیکن چونکہ وہ حصارِ تشکیک اور دوامِ تضاد میں مبتلا ہیں اور عصری سچائیوں نے طرح طرح کی ذہنی تلخیاں اور نفسیاتی الجھنیں ان کے اندر پیدا کردی ہیں اس لیے خدا پر ان کا یقین متزلزل ہے۔''

(''ادبی تقویمات'' مرتبہ۔ ڈاکٹر ارشد مسعود ہاشمی۔ ص۔ ۱۷۶۔۱۷۷)

فکشن میں بیدی اور منٹو قمر اعظم ہاشمی کے پسندیدہ فنکار ہیں۔ ان میں بھی منٹو کا قد قمر اعظم کے نزدیک سب سے اونچا ہے۔ شاید اسی وجہ سے قمر اعظم نے جب ادبی دنیا میں قدم رکھا تو منٹو کے نقش قدم پر متعدد افسانے لکھے۔ یہ اور بات ہے کہ آگے چل کر انھوں نے ان تمام افسانوں کو تلف کردیا۔ قمر اعظم منٹو کے فن کی طرح اس کی تکنیک اور موضوع کو بھی جاندار قرار دیتے ہیں۔ منٹو کے یہاں طنز کی جو شدت ہے وہ قمر اعظم کو اپنا گرویدہ بناتی ہے۔ بیدی کی تحریروں کا فنی شعور اور اسلوب قمر اعظم کے نزدیک نئے لکھنے والوں کے لیے آئیڈیل ہے:

• ''منٹو کا فن''

''بعض حضرات منٹو کی فنکاری تو تسلیم کرتے ہیں لیکن مواد پر حرف لاتے ہیں۔ میرے خیال میں فنکاری کی یہ تقسیم قطعی خام ذہنیت کی ریشہ دوانی ہے۔ فنکار کی بڑائی صرف فن یا تکنیک کی کامیاب پیش کش ہی تک محدود نہیں اور نہ مواد یا موضوع کے انتخاب میں۔ بڑا فنکار دراصل موضوع اور ہیئت کا ایک حسین امتزاج پیش کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس پیش کش میں تاثرات، جذبات اور خیالات کو اس طرح سموتا ہے کہ قارئین بھی اس سے حسب توقع اثرات لیے بغیر نہیں رہتے۔ یہ اثرات وقتی بھی ہوتے ہیں اور دیرپا بھی۔ قاری کے ذہن پر دیر پا نقوش ثبت کرنا بڑی صناعی اور کاریگری کا کام ہے۔ منٹو کی خوبی یہی ہے۔ ساتھ ہی اس کے موضوعات بھی فرسودہ یا لاحاصل نہیں اور نہ اس کی پیش کش کے انداز ہی میں کوئی خامی ہے۔ منٹو نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا اس کو طنز اور نشتر سے بھر کر پیش کیا۔ اس کی تحریر کا یہی تیکھا پن اس کے ہمعصروں میں اسے امتیازی تخصیص بخشتا ہے۔''

(''ادبی تقویمات'' مرتبہ۔ ڈاکٹر ارشد مسعود ہاشمی۔ ص۔ ۴۰۳)

• ''ہمارا افسانہ نگار۔ بیدی''

''بیدی کے یہاں تشبیہات کا استعمال بھی ہے اور ظرافت اور طنز کے نہایت پر اثر عناصر بھی۔ لیکن ان کا کمال فن نہ طنز نگاری ہے نہ ظرافت نگاری اور نہ تشبیہات کا استعمال۔ یہ تمام چیزیں ان کے یہاں محض اضافی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کا کمال ان کے پختہ فنی شعور، تجربہ کا فنکارانہ حسن انتخاب اور طرز اسلوب کی ایک خاص امتیازی صناعی قوت پر مضمر ہے۔ وہ سماج، معاشرہ اور ماحول کے علاوہ انفرادی زندگیوں پر بھی طنز کرتے ہیں۔ لیکن ان کا یہ طنز منٹو کی طرح بے باک بے جھینپ اور شدید نہیں ہوتا۔ بلکہ ''معصوم'' ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کے طنز سے قاری کو ذہنی دھچکا (mental Shock) نہیں پہنچتا ہے۔ تشبیہات کے استعمال میں بیدی، کرشن چندر کی طرح ماحول آفرینی یا فضا بندی نہیں کرتے بلکہ اثر کی شدت کو شدید تر کرتے ہیں۔ وہ ان سب سے افسانوں کے اثرات کو ابھارتے ہیں۔ تشبیہات اور طنزیات کو صحیح طور پر برتنے میں قادر ہیں۔ اور ان کے ذریعہ وہ اپنی تحریر میں زندگی، روانی اور زور اثر پیدا کرتے ہیں۔''

(''ادبی تقویمات'' مرتبہ۔ ڈاکٹر ارشد مسعود ہاشمی۔ ص۔ ۴۱۰۔۴۱۱)

قمر اعظم ہاشمی ایک انصاف پسند ناقد کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ اردو کے بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کے ادبی کارناموں پر بے خوف تبصرے اور تجزیے کے ساتھ انھوں نے اپنے ہمعصروں کی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں کی بلکہ کشادہ قلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کی بھرپور حوصلہ افزائی کی۔ اور ایک بار پھر یہ

ثابت کیا کہ ایک سچا ناقد وہی ہے جو صرف قدیم روایات کا حامی نہ ہو بلکہ جدید رجحانات پر بھی اس کی نظر ہو۔اس ضمن میں شاعر،افسانہ نگار،تنقید نگاران سب کی طرف قمراعظم نے اپنی نگاہ دوڑائی ہے:

• ''ظفراوگانوی کے افسانے''

''وہ (ظفراوگانوی) انٹلکچوئل بننا نہیں چاہتے تھے۔انھوں نے بحیثیت فنکار اپنی جگہ بنانے کی کاوش کی ہے۔اسی لیے افسانوں میں ان کا اندازِ نظر بالائے بام فلسفہ نہیں ہے،تخلیقی ہے،اوراس تخلیقی انداز نظر میں ارضی فکر واحساس کی گرمی ہے۔انھوں نے تشہیر پسندی کا شعار بھی اختیار نہیں کیا تھا۔زندگی کی سختیوں کا محض مشاہدہ نہیں کیا،تجربہ بھی کیا۔خود انھوں نے اپنی زندگی میں اپنے عہد کے تجرباتی آلام کو نہایت خاموشی اور بڑی بے نیازی سے گلے لگا رکھا تھا۔ان تجربوں کے تاثرات کو کہیں رمزی اور کہیں استعاراتی اسلوب میں انھوں نے اپنے افسانوں کے ذریعہ پیش کیا۔یقیناً 1961ء سے 1985ء کے درمیان کے افسانہ نگاروں میں وہ اپنی ایک مستقل نمایاں جگہ رکھتے ہیں۔''

(''ادبی تقویمات'' مرتبہ۔ڈاکٹر ارشد مسعود ہاشمی۔ص۔۴۱۸)

• ''دلکشمن ریکھا کے افسانے''

''منظر کاظمی نے افسانہ وزندگی کو ایک دوسرے سے یوں ہم آہنگ رکھا ہے کہ دوئی،وحدت بن گئی ہے،ایک ایسی تخلیقی وحدت جس کی حسن کارانہ واقعیت اور فنکارانہ بصیرت گہرے نقش قائم کرتی ہے اور جس کا تاثر دیر تک رہتا اور دور تک پھیلتا ہے۔افسانہ نگار کو کیا کہنا ہے؟ کس طرح کہنا ہے؟ کیوں کہنا ہے؟ اس کا واضح ادراک حاصل ہے اور وہ غیر مشروط اندز واسلوب میں اس ادراک کو افسانوی پیرائے کے سپرد یوں کرتا ہے کہ افسانویت بھی قائم رہتی ہے اور کوئی نغمگی پیدا نہیں ہوتی،زندگی کی گرہیں،گتھیاں اور مختلف تہیں سامنے آتی جاتی ہیں۔''

(''ادبی تقویمات'' مرتبہ۔ڈاکٹر ارشد مسعود ہاشمی۔۴۲۴)

• ''لطف الرحمٰن کی غزلیں''

''لطف الرحمٰن کی غزلیں اسلوب ومزاج دونوں ہی جہتوں سے بعض منفرد اوصاف کی حامل ہیں۔پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ انھوں نے غزل کے صنفی مزاج کی بنیادی قدروں کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے۔یعنی ان کی تخلیقی نظر قطعی داخلیت پسندانہ ہے۔رمزیت اور ایمائیت بھی غزل کی ایک بنیادی قدر ہے۔لطف الرحمٰن نے اسے بھی پیش نظر رکھا ہے۔۔۔لطف الرحمٰن کی تخلیقی بصیرت نے اظہار کی تسکین وتشفی کے لیے لفظوں کے نئے تلازمے وضع کیے اور نئی علامتوں اور تازہ تر استعاروں کا استعمال کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں نئی فضا ملتی ہے۔ایک شاداب وتازہ اسلوب سخن ملتا ہے۔''

(ادبی تقویمات'' مرتبہ۔ڈاکٹر ارشد مسعود ہاشمی۔ص۔۳۰۴۔۳۰۵)

قمراعظم ہاشمی کی تنقید نگاری ایک مثبت فکر کی حامل ہے۔وہ تنقید کو تیز وتند نہیں کرتے ہیں۔وہ فیصلہ صادر کرنے کے بجائے ایک مخلصانہ ہمنوائی سے کام لیتے ہیں۔لیکن پتا نہیں کیوں جب وہ اکبر کا ذکر کرتے ہیں تو ان کے ہاتھ سے احتیاط کا دامن چھوٹ جاتا ہے اور جس تنقیدی اعتدال کے لیے قمراعظم جانے جاتے ہیں اس پر مایوسی ہوتی ہے۔فکر سرسید اور علی گڑھ تحریک کی دوسری سمت اکبر کی شاعری ضرور بڑھتی ہے۔لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ ہم اکبر کا مطالعہ سرسید کے مدمقابل ہی کریں؟اگر ہم سرسید کے مقابلے اکبر کا مطالعہ نہ کریں تو ہمیں اکبر کے یہاں ایسے لعل وگہر ملیں گے جنھیں پاکر آنکھیں خیرہ ہوجائیں گی۔اکبر نے قدیم روایات کی جانب پلٹ جانے کے لیے جس حد تک زور دیا ہے وہ بس اتنا ہی کہ مغربی آؤٹ لُک کے باوجود مشرقی تہذیب اندرون جسم باقی رہے۔اور پھر یہ کہ جب خود اکبر نے آگے چل کر سرسید کی جانفشانیوں اور قربانیوں کا اقرار کرلیا تو پھر اکبر پر انگشت نمائی اچھی نہیں لگتی۔شاید قمراعظم ہاشمی اکبر کا مطالعہ اس انداز میں نہ کرسکے۔اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید انھیں اپنے مقالہ ''اکبر راجع یا مصلح'' میں یہ لکھنے کی نوبت نہ آتی۔

''جب تک کوئی شخص اپنے عہد کے حالات سے غیر مطمئن نہ ہو،پریشان نہ

ہو، مضطرب نہ ہو، اس وقت تک تبدیلی وتغیر کی خواہش، اس کے اندر موجزن نہیں ہوسکتی۔ یہی خواہش دراصل اصلاحی احساس وفکر کی نشوونما کرتی ہے اور اپنے عہد کے حالات سے غیر مطمئن شخص کو بہتر اور محفوظ ومطمئن مستقبل کی دریافت پر مائل کرتی ہے۔ اصلاح کے اس مفہوم کا اطلاق اکبر کی شاعری پر نہیں ہوتا کیونکہ وہ تغیر کے ہرگز خواہاں نہ تھے۔ وہ تو اپنے عہد کے تغیر سے خائف تھے۔ محفوظ ومطمئن مستقبل کے وہ جویا ہی نہ تھے۔ روایت ماضی کی خستہ حال دیواروں سے چمٹے رہنے ہی میں سکون وعافیت دیکھتے تھے۔ کسی نئی صورت حال کے متمنی نہ تھے، قانع حالات تھے۔ یعنی یہ کہ اکبر کو نہ بہتر مستقبل کی تلاش تھی نہ اصلاح معاشرہ کی فکر۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں معاشرتی اصلاح کا پہلو ان کی شاعری میں دریافت کرنا میرؔ کی شاعری میں ظریفانہ پہلو دریافت کرنے کی مہم کے مترادف ہے۔''

(''ادبی تقویمات'' مرتبہ۔ ڈاکٹر ارشد مسعود ہاشمی'' ص۔۴۳۵)

بہرصورت قمر اعظم ہاشمی ہمارے عہد کے ایک اہم ناقد ہیں۔ ان کی تحریروں میں ایک وقار ہے، نیا پن ہے، شفافیت ہے۔ وہ سنجیدگی اور ذمہ داری کے ساتھ قاری سے مخاطب ہوتے ہیں۔ ان کی ناقدانہ بصیرت کی داد ہمعصروں نے بھی دی ہے۔ اوران کے قلمی نگارشات کو ادبی تنقید کی دنیا میں اضافہ قرار دیا ہے۔ چند اقتباسات کے مطالعہ سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے:

''پروفیسر ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی اپنی تنقیدات میں میانہ روی، اعتدال پسندی اور مرنجاں مرنج رویہ اختیار کرتے ہیں۔ عملی تنقید میں ان کا اندازِ بیاں اکثر سادہ اور تجزیاتی ہوتا ہے۔ ہاں جب وہ نظریاتی تنقید لکھتے ہیں یا پھر کسی موضوع پر لکھنے سے پہلے (عادتاً یا معمولاً) جب وہ تمہید باندھتے ہیں تو فلسفیانہ خیال آرائی کو راہ دیتے ہیں یا شاعرانہ اسلوب اختیار کرتے ہیں جس میں زیادہ روانی ہوتی ہے۔ زیادہ زور آہنگ پایا جاتا ہے اور تخلیقی تنقید کے جلوے آشکار ہوتے ہیں۔''

پروفیسر نجم الہدیٰ

(سہ ماہی ''اصنافِ ادب'' مظفرپور۔ ص۔۴۳)

''قمر اعظم ہاشمی نے اردو ڈراموں کی تنقید میں قابل ذکر تحریریں پیش کی ہیں۔ اس میدان میں آج بھی ان کی جگہ محفوظ ہے۔ انھوں نے اردو ڈراموں کے تشکیلی عناصر اور بدلتی ہوئی سماجی اور تہذیبی صورتِ حال میں جن نئے خطوط کی ضرورت پر زور دیا ہے وہ بھولنے کی چیز نہیں ہے۔''

علیم اللہ حالیؔ

(''قمر اعظم ہاشمی: ایک ہمہ جہت شخصیت'' مرتبہ۔ ڈاکٹر ولی احمد ولیؔ۔ ص۔۱۵۸)

''قمر اعظم ہاشمی اردو کے ان چند باضمیر نقادوں میں ہیں جنھوں نے اپنے عہد کی مطلق صداقت کو فنکار کی داخلی سچائی بھی تصور کیا ہے۔ اس سچائی کا ادراک ہی فنکار کو دیگر انسانوں سے مختلف مقام عطا کرتا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں وہ قوت پرواز کو نظریاتی نمائشوں کی اسیری نہیں دیتا، بلکہ وہ اپنی معاشرتی وراثت اور تہذیبی تاریخ کی مثبت قدروں میں ہی صالح انسانی اقدار کی اور انسانیت کی بقا کی جستجو کرتا ہے۔ اس عالم میں اس کا مقابلہ اس صداقت سے ہوتا ہے جو نہ رسمی ہے، نہ مصنوعی، نہ مستعار۔''

پروفیسر اسلم آزاد

(''قمر اعظم ہاشمی: ایک ہمہ جہت شخصیت'' مرتبہ۔ ڈاکٹر ولی احمد ولیؔ۔ ص۔۱۷۲)

''قمر اعظم ہاشمی کا زمانہ ترقی پسندوں اور جدیدیوں کا زمانہ تھا لیکن وہ ان ادبی گروہوں سے نظریاتی وابستگی پیدا کئے بغیر شعروادب کی خدمت کرتے رہے۔ وہ نہ ترقی پسندوں سے مرعوب ہوئے اور نہ جدیدیوں کی جدت طرازی سے مسحور۔ وہ اپنے تہذیبی سرمائے کی قدروقیمت پہچانتے ہیں۔ وہ ادب کی اخلاقی قوت کے بھی منکر نہیں۔ وہ اس کی جمالیاتی خوبیوں پر بھی زور دیتے ہیں۔ اس لیے ان کی تنقید اعتدال وتوازن کے جادہ پر گامزن رہی۔ وہ نظریہ کی عینک چڑھائے بغیر شعروادب کا مطالعہ کرتے رہے اور ادب کی مثبت قدروں کی ترویج واشاعت

میں ہمہ تن مصروف ومنہمک رہے۔''

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں

(''قمر اعظم ہاشمی: ایک ہمہ جہت شخصیت'' مرتبہ۔ڈاکٹر ولی احمد ولی۔ص۔۱۸۵)

ممتاز ادیب مسعود شمس نے اپنی تحریر میں قمر اعظم کی علمی وادبی فتوحات کا جائزہ لیتے ہوئے بڑی سچی بات لکھی ہے:

''حقیقت میں پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کی شخصیت اس گہرے سمندر جیسی ہے جس کی سطح پر مچلنے والی لہروں کا شور تو سنائی دیتا ہے لیکن جس کی زیریں لہریں بڑی خامشی اوریکسوئی کے ساتھ اپنی منزلوں کی جانب گامزن رہتی ہیں۔ پروفیسر ہاشمی کے جو بھی علمی، ادبی کارنامے ہیں ان کی حیثیت مسلم ہے اورانہی کارناموں کے ذریعہ آنے والی نسلیں انھیں یادرکھیں گی۔لیکن اس سے بھی بڑھ کر خامشی اوردل جمعی کے ساتھ سر کی گئیں کامیابی اورکامرانی کی وہ منزلیں ہیں جو لسانی تحریک سے وابستگی کے بعد اردو زبان کواس کا جائز مقام دلانے میں، ان کی بے پناہ کاوشوں اوردی گئی قربانیوں کی امین ہیں اورآج کی نئی نسل کے لیے مشعل راہ اورقابل تقلید بھی ہیں، جواپنی زبان وتہذیب کے تئیں بے حسی اور بے گانگی کا شکار بنی ہوئی ہیں۔''

مسعود شمسی

(''آئینہ پس آئینہ''۔مرتبہ ڈاکٹر ارشد مسعود ہاشمی۔ص:۱۱۹)

قمر اعظم ہاشمی: بحیثیت صحافی

پروفیسر قمر اعظم ہاشمی ایک جیّد استاد، بلند پایہ محقق اور ناقد کے ساتھ ساتھ ایک دیدہ ور صحافی بھی تھے۔انھوں نے بحیثیت صحافی اردو صحافت کو ایک تعمیری اور مثبت فکر سے ہمکنار کرنے کی بھرپور کوشش کی۔یونیورسٹی سروس میں آنے سے قبل وہ کئی اخبارات سے منسلک ہوئے جن میں ''قومی تنظیم''، ''سنگم''، ''کوہ کن''، ''پندار'' اور ''آئین نو'' کے نام شامل ہیں۔ان اخبارات میں اداریہ کے علاوہ شائع ان کے مضامین بے حد اہم وقیع اور پُرمغز ہوتے تھے۔ان کی صحافتی فکر میں ''سیکولرزم'' کو کلیدی حیثیت حاصل تھی۔موصوف نے اپنے مضامین کے ذریعہ باشندگان ملک اورحکومت کو یہ احساس دلایا کہ اردو کسی مذہب اورفرقہ کی زبان نہیں ہے بلکہ ایک تہذیبی زبان ہے۔ان کے افکار ہمیشہ توجہ طلب اورمثبت رہے۔انھوں نے صحافت کے دامن کو سیاست سے بچا کر رکھا۔انھوں نے اپنے بے شمار مضامین میں قومی یکجہتی، سیکولرزم اورانسان دوستی پر زور دیا۔ان کا قلم ہمیشہ بے باک رہا۔اس طرح ان کی صحافتی خدمات ناقابل فراموش رہی ہیں۔قمر اعظم صاحب نے سب سے پہلے پندرہ روزہ ''قومی تنظیم'' دربھنگہ کے کارگذار مدیر کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیں۔قومی تنظیم سے اپنی وابستگی کا تذکرہ پروفیسر ہاشمی نے اپنی خود نوشت میں یوں کیا ہے:

''امتحان (ایم۔اے) کے بعد جولائی ۱۹۶۳ء میں چند مہینوں کے لیے میں پٹنہ سے دربھنگہ آگیا۔قیام کے دوران ملّت کالج کے چند اساتذہ سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔یہاں اخبار قومی تنظیم (موجودہ روزنامہ ''قومی تنظیم'' پٹنہ) کے بانی مدیر ایس۔ایم۔عمر فرید صاحب نے استادگرامی پروفیسر آغا عمادالدین کے توسط سے مجھے پکڑا اور پندرہ روزہ قومی تنظیم کی ایڈیٹنگ کی ذمہ داری میرے سپرد کردی۔یہ

صحافت سے دلچسپی کی ابتدا تھی۔ ایس ایم عمر فرید قوم کی خدمت کا جذبہ رکھتے تھے اور مسلمانوں کی بدحالی کا درد بھی ان کو تھا۔ ڈاکٹر سید عبدالحفیظ سلفی کے چھوٹے بھائی تھے۔ والد سید فرید عالم صاحب مدرسہ احمدیہ سلفیہ کے بانی تھے اور بڑے بھائی ڈاکٹر عبدالحفیظ سلفی صاحب ملّت کالج کے بانی تھے۔ ایس ایم عمر فرید اور پروفیسر آغا عماد الدین صاحب میں قومی دردمندی کا جذبہ تھا۔ دونوں میں گہری فکری ہم آہنگی تھی۔ عمر فرید صاحب کی مہموں میں آغا صاحب ساتھ ساتھ ہی نہیں پیش پیش رہا کرتے تھے۔ ان بزرگوں کی فرمائش سے میں انکار نہیں کر سکا اور قومی تنظیم کو اپنے ذمہ لے لیا۔ ''لائٹ ہاؤس'' کے قریب دفتر بنایا گیا تھا۔ مجھ سے پہلے ڈاکٹر نجم الہدیٰ صاحب (سابق صدر شعبۂ اردو مدراس یونیورسٹی اور بہار یونیورسٹی) اسے ترتیب دے رہے تھے۔ شعبۂ اردو ایل ایس کالج میں ان کی تقرری کے بعد قومی تنظیم کی ذمہ داری میں نے سنبھال لی تھی۔ دربھنگہ میں جب تک رہا قومی تنظیم کو ترتیب دیتا رہا۔''

(سرسری اس جہان سے گذرے۔ پروفیسر قمر اعظم ہاشمی۔ ص:۲۵-۲۶)

دربھنگہ چھوڑ کر پٹنہ آجانے کے بعد قمر اعظم صاحب ''سنگم'' سے وابستہ ہوئے۔ ۱۹۶۳ء کے اواخر کی بات ہے کہ کلیم عاجز صاحب کی دکان ''جنرل بیڈنگ اسٹور'' میں ایک روز سنگم کے ایڈیٹر جناب غلام سرور سے ہاشمی صاحب کی ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں سرور صاحب نے ہاشمی صاحب کو سنگم سے منسلک ہونے کی پیش کش کی؛ جسے انھوں نے قبول کیا اور اس سے منسلک ہوگئے۔ اس سلسلہ میں قمر اعظم ہاشمی نے لکھا ہے:

> ''انھوں نے (غلام سرور) مجھ سے پوچھا تم ان دنوں کیا کر رہے ہو''؟ میں نے جواب دیا کسی معقول سروکار کی جستجو میں ہوں۔ سرور صاحب نے فرمایا 'سنگم' کو روزنامہ بنا رہا ہوں۔ اس میں تعاون کرو۔ اس وقت مجھے سنگم کی ملّت پسندی سے خاصی دلچسپی تھی۔ حامی بھر لی۔ اس کے دو ہفتہ بعد ہی اس اخبار کو ہفت روزہ سے روزنامہ میں منتقل کرنے کی سرگرمی شروع ہوگئی۔ سنگم کا نیا سرنامہ تیار ہوتے ہی

روزنامہ کی اشاعت کا آغاز ہوگیا۔''

(سرسری اس جہان سے گذرے۔ پروفیسر قمر اعظم ہاشمی۔ ص:۳۰)

قمر اعظم ہاشمی نے ''سنگم'' سے منسلک ہونے کے بعد وہاں ورکنگ ایڈیٹر کی حیثیت سے برسوں کام کیا۔ ''سنگم'' حکومت اور کانگریس مخالف اخبار تھا۔ اس لیے اسے سرکاری اشتہار نہیں ملتا تھا۔ جس کے سبب اس کی اشاعت کو بغیر کسی رکاوٹ کے جاری رکھنا ایک مشکل کام تھا۔ لیکن غلام سرور صاحب حوصلہ مندی اور استقامت کے ساتھ اس کی اشاعت کو جاری رکھے رہے۔ کاتب حضرات پیٹ پر پتھر باندھ کر کام کرتے تھے۔ کبھی کبھی کسی وسیلے سے روپے آجاتے تو سرور صاحب اسے کاتبوں میں تقسیم کر دیتے۔ غلام سرور صاحب جب جیل جاتے تو ان کے قید و بند رہنے کے وقفے میں اخبار کو جاری رکھنا ہاشمی صاحب کے لیے ایک چیلنج بن جاتا تھا۔ ۱۹۶۴ء کا واقعہ ہے کہ جب کے۔ بی۔ سہائے بہار کے وزیر اعلیٰ تھے اس وقت حکومت مخالف تحریر شائع کرنے کی پاداش میں غلام سرور صاحب کو گرفتار کر کے اسیرِ زنداں کر دیا گیا۔ موصوف کی گرفتاری کا مقصد یہ تھا کہ انھیں قید کر لینے سے ''سنگم'' خود ہی بند ہو جائے گا۔ اس سخت مرحلہ میں قمر اعظم ہاشمی نے سنگم کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی اور اپنے ایک دوست جناب شبّیر احمد کو پریس کی ذمہ داری دی اور دوسرے دوست لطف الرحمٰن کو فنڈ کی فراہمی کی ذمہ داری سونپی تا کہ اخبار نکلتا رہے۔ اس مشکل وقت کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر لطف الرحمٰن لکھتے ہیں:

> ''قمر اعظم پر طرح طرح سے دباؤ ڈالا گیا کہ وہ ''سنگم'' سے بے تعلق ہوجائیں، مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ ''سنگم'' کو جاری رکھا بلکہ اس کی اسپرٹ اور اس کے مزاج کو بھی پورے طور پر برقرار رکھا۔ اس وقت پٹنہ میں کوئی دوسرا متنفس نہیں تھا جو اس خلا کو پُر کرتا۔ یہ کام قدرت نے قمر اعظم ہاشمی سے لیا اور جب تک غلام سرور زنداں خانے کی رونق بڑھاتے رہے، قمر اعظم یہ بوجھ اُٹھائے چلتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ غلام سرور، قمر اعظم ہاشمی کے ہمیشہ احسان مندر ہے۔''

(پروفیسر قمر اعظم ہاشمی: ایک ہمہ جہت شخصیت۔ ص:۷۲)

۱۹۶۵ء میں ہندو پاک جنگ ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اردو کا نام لینے والے ''پاکستانی'' کہے

جاتے تھے۔ پھر بھی غلام سرور صاحب اور ان کے رفقائے کار اردو کے مسائل کو بے باکی سے اٹھاتے رہتے تھے۔ اردو کی حمایت میں آواز بلند کرنے اور کانگریسی حکومت کی مخالفت کرنے کے سبب اس جنگ کے زمانے میں غلام سرور صاحب کو گرفتار کر کے اسیرِ زنداں کر دیا گیا تھا۔ سنگم کی ادارت میں رہنے کے سبب مولانا بیتاب صدیقی اور قمر اعظم ہاشمی کے نام بھی ڈی۔ آئی۔ آر کا وارنٹ جاری ہوا۔ مولانا تو جیل چلے گئے لیکن پروفیسر اختر اورینوی نے اپنے اثر و رسوخ کا استعمال کرتے ہوئے ایک ذاتی مچلکہ کی بنیاد پر قمر اعظم ہاشمی کا وارنٹ منسوخ کروا دیا اور ہاشمی صاحب جیل جانے سے بچ گئے۔ اب ''سنگم'' کو پابندیٔ وقت سے شائع کرتے رہنے کی ذمہ داری ہاشمی صاحب کے سر آ گئی۔ اخبار کی کوئی آمدنی نہ تھی، نہ کوئی مالی سہارا تھا۔ سرکاری اشتہارات سے تو یہ اخبار روزِ اوّل سے ہی محروم تھا۔ ایسی صورتحال میں اخبار کی اشاعت کو جاری رکھنا حد درجہ مشکل کام تھا۔ قمر اعظم ہاشمی نے اس صورتحال کی عکاسی کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ایسی صورتحال میں اخبار کی اشاعت کو جاری رکھنا میرے لیے جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ میں نے ہمت نہیں ہاری۔ کبھی کبھی جیل سے سرور صاحب کا کوئی پُرزہ مل جاتا تھا۔ ''فلاں شخص سے جا کر مل لیجیے''۔ کبھی غلام محمد (کاغذ تاجر) کے نام کوئی پُرزہ مل جاتا اور اخبار کے لیے کاغذ کی فراہمی ہو جاتی تھی۔۔۔ اخبار کی اشاعت جاری رہی، البتہ میں دفتر نہیں جاتا تھا۔ پس منظر میں رہ کر کام کرتا رہا۔ چند مہینوں بعد یہ حضرات جیل سے باہر آئے اور تب حالات نارمل ہوئے۔''

(سرسری اس جہان سے گزرے۔ پروفیسر قمر اعظم ہاشمی۔ ص:۳۷)

روزنامہ ''سنگم'' سے وابستگی کے ہی زمانہ میں قمر اعظم ہاشمی نے ''قومی تنظیم'' پٹنہ کی اشاعت کی ذمہ داری بھی قبول کر لی تھی۔ قومی تنظیم اس زمانہ میں ہفتہ وار اخبار تھا۔ اخبار کے مالک اور بانی سید عمر فرید صاحب اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے سبب پٹنہ میں قیام پذیر ہونے سے مجبور تھے۔ چنانچہ انھوں نے قمر اعظم ہاشمی کو اخبار کی ادارتی ذمہ داری سونپ دی۔ یہ دوسرا موقع تھا جب قمر اعظم ہاشمی کے ذمہ قومی تنظیم کی ادارت کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ہاشمی صاحب نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے:

''۱۹۶۵ء غالباً مئی میں محترم سید عمر فرید صاحب مجھے تلاش کرتے ہوئے روزنامہ

سنگم کے دفتر میں تشریف لائے۔ انھوں نے فرمایا کہ ''قومی تنظیم کو اب پٹنہ ہی سے شائع کرنے کا عزم لے کر آیا ہوں۔ میرا حق ہے، مدد کر دیجیے۔'' میں دربھنگہ کے اس پندرہ روزہ اخبار کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ عمر فرید صاحب کے مشورہ سے اس پندرہ روزہ کا میں نے ملّت کالج نمبر بھی شائع کیا تھا جو کافی پسند کیا گیا۔ ۱۹۷۰ء میں پٹنہ کو میں نے خیر باد کہا تو ایک محدود وقفے کے بعد یہ روزنامہ بن کر منظر عام پر آیا۔''

(ایضاً:۳۴)

قومی تنظیم کی ادارت کے زمانے میں بھی قمر اعظم صاحب نے اپنے دوستوں شبیّر احمد اور لطف الرحمٰن کو اپنا معاون مقرر کیا۔ شبیّر صاحب کو پریس کی ذمہ داری سونپی گئی اور لطف الرحمٰن صاحب کو اعزازی مدیر مقرر کیا۔ ان تینوں دوستوں نے مل کر اخبار کو حتی الامکان فروغ دینے کی کوشش کی۔ لطف الرحمٰن صاحب کے بھاگلپور چلے جانے کے بعد بھی بہت دنوں تک بلکہ بہار یونیورسٹی میں اپنی تقرری سے پہلے تک قمر اعظم ہاشمی صاحب قومی تنظیم سے منسلک رہ کر اس کے فروغ کے لیے کوشاں رہے۔ موصوف قومی تنظیم کے ہمیشہ مدّاح اور اس کے قاری رہے ہیں۔ قومی تنظیم کے مظفر پور بیورو چیف جناب این۔ نیازی (مرحوم) کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے انھوں نے قومی تنظیم کو اپنا پسندیدہ اخبار قرار دیا اور کہا کہ:

''قومی تنظیم میرا پسندیدہ اخبار ہے۔ کیونکہ اس نے بہار میں متوازن صحافت نگاری کی روایتوں کو فروغ بھی دیا اور اردو کے مسئلہ سیاسی، مذہبی یا برادرانہ مسلک کی آنکھ بند کر کے پاسداری نہیں کی اور منصفانہ باتوں کو نظر انداز بھی نہیں کیا۔ ملّی معاشرہ کے مفادات کو اس نے ہمیشہ سامنے رکھا۔ سماجی زندگی کے معاملات و مسائل کی صحیح ترجمانی بھی کی اور اقلیتی طبقے کی الجھنوں اور حق تلفیوں کو سنجیدگی اور ہمدردی کے ساتھ سامنے لاتا رہا اور آج بھی لا رہا ہے۔''

(آئینہ پسِ آئینہ۔ مرتبہ: ارشد مسعود ہاشمی۔ ص:۳۲)

قمر اعظم ہاشمی نے ۱۹۶۵ء میں ہی اپنا ہفت روزہ ''کوہکن'' جاری کیا تھا جو گورنمنٹ کے اشتہاروں کے لیے منظور بھی ہو گیا۔ ۱۹۶۹ء میں پٹنہ چھوڑتے وقت ہاشمی صاحب نے ''کوہکن'' کو اپنے

ایک ہم جماعت اور دوست شمس الہدیٰ استھانوی کے حوالے کردیا جو پہلے سے ''ہمارانعرہ'' نکال رہے تھے۔قمراعظم ہاشمی کے عزیز شاگرد ڈاکٹر ولی احمد ولی پندرہ روزہ ''کوہکن'' کی خصوصیت کے تعلق سے رقمطراز ہیں:

''کوہکن'' کے ادبی کالم پروفیسر قمراعظم ہاشمی کی نگارشات سے مزین ہوا کرتے تھے۔تقریباً ہر شمارے میں کسی نہ کسی شاعر یا ادیب کا تعارف اوران کے شہہ پاروں کا تجزیاتی مطالعہ شامل اشاعت ہوتا تھا۔اس کے علاوہ ان کے اداریے بھی بے حد غیر جانبداراورفکرانگیز ہوا کرتے تھے۔مگر تلاش بسیار کے باوجوداس کا ایک بھی نسخہ دستیاب نہ ہوسکا۔''

(پروفیسر قمراعظم ہاشمی: ایک ہمہ جہت شخصیت۔ص:۱۴)

''قومی تنظیم''، ''سنگم'' اور ''کوہکن'' کے علاوہ ہفت روزہ ''پندار'' اور ''ندائے عوام'' سے بھی قمراعظم ہاشمی کی وابستگی رہی۔اس کے علاوہ ایم۔شمیم جرنلسٹ کی ادارت میں مظفرپور سے نکلنے والے ''آئینِ نو'' کی اشاعت میں بھی ہاشمی صاحب نے اہم رول ادا کیا۔اس طرح اس زمانے کے تقریباً تمام اہم اردو اخبارات ورسائل میں ہاشمی صاحب کے مضامین اوران کی نگارشات شائع ہوتی تھیں اوردلچسپی سے پڑھی جاتی تھیں۔

پروفیسر قمراعظم ہاشمی کی صحافتی خدمات کے ذیل میں رسالہ ''توازن'' دربھنگہ کے علاوہ ''ساغرِ نو'' پٹنہ کا خصوصی ذکر لازمی ہے۔۱۹۶۴ء میں قمراعظم ہاشمی کی ادارت میں رسالہ ''ساغرِ نو'' جاری ہوا،جس کے تین شمارے نکلے۔تیسرا شمارہ پروفیسر اختر اورینوی صدر شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی کی شخصیت اورادبی خدمات پر مشتمل تھا جو ''اختر اورینوی نمبر'' کے نام سے ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔یہ رسالہ ۵۱۶ صفحات پر مشتمل تھا،جس میں ملک بھر کے مایۂ ناز ادیبوں،قلمکاروں اوردانشوروں کی نگارشات شامل تھیں۔یہ کارنامہ ہراعتبار سے لائق ستائش قرار پایا۔''ساغرِ نو'' کا یہ شمارہ ایک تاریخی دستاویز ثابت ہوا۔جس کی پوری ادبی دنیا میں پذیرائی ہوئی۔یہ خصوصی شمارہ قمراعظم ہاشمی کی صحافتی صلاحیت کا مظہر بھی ثابت ہوا۔اختر اورینوی نمبر کی ترتیب میں قمراعظم ہاشمی صاحب کے معاون کے طور پر لطف الرحمٰن صاحب نے اہم کردارادا کیا۔ان حضرات کو پروفیسر عبدالمغنی اور جناب رضا نقوی واہی کی سرپرستی بھی حاصل

تھی۔''ساغرِنو'' کا ''اختر اورینوی نمبر'' اس قدر اعلیٰ وارفع ثابت ہوا کہ اس کے مضامین رسالہ ''مہرنیم روز'' کراچی (پاکستان) کے اختر اورینوی نمبر میں شامل کیے گئے۔رسالہ کی معنویت اورافادیت کے پیش نظراس کے منتخب مضامین کا ایک مجموعہ ''اختر شناسی'' کے نام سے پروفیسر قمراعظم ہاشمی کے لائق وفائق فرزند ڈاکٹر ارشد مسعود ہاشمی نے ۲۰۰۸ء میں شائع کیا جس کی بھی ادبی دنیا میں کافی پذیرائی ہوئی۔

پروفیسر قمراعظم ہاشمی نے اپنے ہونہار شاگردوں کے تعاون سے مظفرپور سے ایک ادبی رسالہ ''ادراک'' جاری کیا جس کا پہلا شمارہ جولائی ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا۔''ادراک'' کے دواورشمارے جنوری ۱۹۸۳ء اورجنوری ۱۹۸۴ء میں منظرعام پرآئے۔اس کے بعد ''ادراک'' کا کوئی شمارہ منظرعام پر نہیں آیا۔ادراک میں بہار اور بیرون بہار کے اچھا لکھنے والوں کی تحریریں شائع ہوتی تھیں۔خود قمراعظم ہاشمی کے مضامین بھی شامل شمارہ ہوا کرتے تھے۔''اداراک'' کی یہ خصوصیت تھی کہ یہ رسالہ کسی ادبی گروہ بندی کا شکار نہیں تھا اوراس میں مختلف نظریات کے حامل اشخاص کو جگہ دی جاتی تھی۔قمراعظم ہاشمی ''ادراک'' کے نگراں تھے،جبکہ مجلس ادارت میں محمد سلیم اللہ،ولی احمد ولی اورسید حسن عباس کے نام شامل تھے۔''ادراک'' کا ہر شمارہ پچھلے شمارہ سے بہتر معیار کا حامل ثابت ہوا۔اس کامیابی کا سہرا پروفیسر قمراعظم ہاشمی کے سرجاتا ہے۔چونکہ موصوف ہی اس رسالہ کے سرپرست اورروح رواں تھے۔اردو کے نابغۂ عصر ادیب وناقد پروفیسر نجم الہدیٰ (سابق صدر شعبۂ اردو مظفرپور) نے اپنی تحریر ''قمراعظم ہاشمی: شخص اور مصنف'' میں رسالہ ''ادراک'' پراپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ادراک کے ان تینوں شماروں میں ایک مستقل عنوان 'پیانے' کے تحت کتابوں پر تبصرے ہیں جو متعدد کتابوں پر بعض مختلف اور بعض بتکرار تبصرہ نگاروں کے ناموں کے ساتھ شائع ہوئے ہیں۔ان سب سے قمراعظم صاحب کی محنت شاقہ اوردائرہ اثر کا سراغ ملتا ہے۔مجلّہ ''ادراک'' میں تبصرہ لکھنے والے کتنے گمنام لوگوں کے اشہبِ قلم کو انھوں نے مہمیز کیا اور کتنے ایسے لوگوں کے نام طباعت کے صفحات پر مرتسم ہوگئے جو پھر کہیں نظر نہیں آئے۔ایک سب سے اہم اورمنفرد تبصرہ خود قمراعظم ہاشمی کی کتاب 'عصری ادب کا شعور' پر ملتا ہے جو ادیب شہیر مرحوم احمد جمال پاشا کی انفرادیت پر دال ہے۔بقول تبصرہ نگار یہ کتاب ڈاکٹر قمراعظم ہاشمی کے سترہ تنقیدی

مضامین کا مجموعہ ہے جو ماضی قریب اور ماضی بعید کے بعض موضوعات کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کے شعر وادب کا بھی جائزہ ہے۔''

(پروفیسر قمر اعظم ہاشمی: ایک ہمہ جہت شخصیت۔ص:۵۸۔۵۹)

''ادراک'' نے محض تین شماروں کے ذریعہ اردو کے ادبی حلقے میں اپنی ایک مخصوص شناخت قائم کر لی تھی۔لیکن وسائل کی کمی اور مجلس ادارت کے ارکان کے بکھر جانے کے سبب رسالے کی اشاعت بند ہوگئی۔لیکن مجلس ادارت کے ایک اہم رکن ڈاکٹر سید حسن عباس نے ایران سے اپنی تعلیم مکمل کر کے واپس آنے کے بعد دوبارہ ہمت جٹائی اور ۲۰۰۱ء سے اسے مظفر پور کے بجائے ''گوپال پور،سیوان'' سے نکالنا شروع کیا،جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے اوراس کا دائرہ بھی پہلے سے بہت وسیع ہوگیا ہے۔جسے پروفیسر قمر اعظم ہاشمی نے اپنی زندگی میں بہ نظر تحسین دیکھا اور بقول ڈاکٹر سید حسن عباس ''اس کے معیار مضامین اور طباعت پر اظہار رضایت فرمایا۔''

قمر اعظم ہاشمی اور اردو تحریک

پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کو اردو سے والہانہ محبت تھی۔وہ نہ صرف اردو زبان وادب کے معروف استاد اور نامور ادیب، ناقد اور محقق تھے بلکہ بہار کی اردو تحریک کے مضبوط اور جانباز سپہ سالار بھی تھے۔بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دلانے کی تحریک میں ان کا رول نمایاں رہا ہے۔اس تحریک کو انھوں نے جس خلوص ،محنت اور انہماک سے مضبوطی بخشی وہ بہار کی اردو تحریک کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔اردو تحریک کے لیے ان کی خدمات کا اعتراف بہار کی اس تحریک کے اہم قافلہ سالار صدر انجمن ترقی اردو بہار پروفیسر عبدالمغنی نے ۱۱؍ستمبر ۲۰۰۵ء کو پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کی لسانی ،صحافتی ،تدریسی ،علمی وادبی خدمات کے اعتراف میں منعقدہ سمینار (بمقام عابدہ ہائی اسکول ،مظفر پور) کے موقع پر اپنے خطبۂ استقبالیہ میں یوں کیا تھا:

> ''پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کا تعاون اردو تحریک کو اس طرح حاصل ہوا کہ اگر وہ تعاون حاصل نہیں ہوتا تو میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ تحریک کامیاب ہوسکتی تھی یا نہیں۔اردو کے استاد تو بہت تھے،آج بھی ہیں لیکن اردو تحریک سے تعلق رکھنا اور اس کی مشکلات کو برداشت کرنا اردو کے ہر استاد کے بس کی بات نہیں ہے۔یہ ایک طرح سے جان جوکھوں کا کام ہے۔اردو تحریک کے ساتھ کامیاب تعاون اردو کے استادوں نے ،شاگردوں نے ،دوستوں نے بھی کیا اور اس تعاون کے فراہم کرنے میں پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کا حصّہ میں سمجھتا ہوں کہ اردو کے ہر استاد سے بڑھ کر ہے۔''
>
> (پروفیسر قمر اعظم ہاشمی: ایک ہمہ جہت شخصیت۔ص:۴۷)

پروفیسر قمر اعظم ہاشمی نے دوران طالب علمی سے ہی تنظیمی وتحریکی سرگرمیوں میں حصّہ لینا شروع

کردیا تھا۔ یہ دل چسپی ان کے مزاج اوران کی فکر سے ہم آہنگ تھی۔وہ جس تنظیم وتحریک سے منسلک ہوجاتے پھراس کے علمبرداراورروحِ رواں ہوجاتے۔ان کی اس خصوصیت کے پیش نظر ہی پروفیسرنجم الہدیٰ صاحب کی یہ رائے تھی کہ ''تنظیم وتحریک ڈاکٹرقمراعظم ہاشمی کے خمیر کا حصّہ ہیں۔''

ملک کی آزادی کے بعد ہندوستان میں اردو کے مستقبل کو لاحق خطرہ کے پیش نظراس کے تحفظ اور بقا کے لیے انجمن ترقی اردو(ہند) کے پلیٹ فارم سے جدوجہد شروع کی گئی جوآگے چل کرایک تحریک کی شکل اختیار کرنے لگی۔اردو کے حقوق کی حصولیابی کے لیے ۱۹۵۰ء میں جناب غلام سرور نے اپنے رفقا کے تعاون سے پٹنہ میں ایک اردو کانفرنس منعقد کی جس میں جوشؔ ملیح آبادی نے بھی شرکت کی۔اس کانفرنس کے بعد باضابطہ بہار میں اردوتحریک کی شروعات ہوگئی۔''لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا''۔پروفیسرقمراعظم ہاشمی نے جب ملّت کالج،دربھنگہ سے بی۔اے پاس کرنے کے بعد۱۹۶۱ء میں ایم۔اے کی تعلیم کے لیے پٹنہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو یہاں انجمن ترقی اردو کی اس تحریک سے متاثر ہوئے اورانجمن کی میٹنگوں میں بحیثیت سامعین حصّہ لینے لگے۔ان میٹنگوں میں حصہ لینے کا ذکرانھوں نے اپنے ایک مضمون ''انجمن کی ان کہی باتیں''میں یوں کیا ہے:

''میں ۱۹۶۱ء سے انجمن ترقی اردو کی سرگرمیوں میں شامل رہا۔پٹنہ میں زیرتعلیم تھا توایک طرف استاد عالی پروفیسراختراورینوی مرحوم ترغیب دیتے تھے تو دوسری طرف جناب غلام سروراور پروفیسرعبدالمغنی صاحبان کے جذبۂ اردو دوستی سے تحریک ملتی تھی۔زبانِ اردو کا طالب علم تھا اوراس زبان کی حق تلفیوں پر جی کُڑھتا تھا۔اس وقت انجمن کی سرگرمیوں میں حصہ لینا قوم دشمنی تھی۔لیکن میں اپنی پیاری زبان کے لیے ہرممکن مجاہدہ کرنے کو تیار رہتا تھا۔''

(سہ ماہی ''تمثیلِ نو'' دربھنگہ۔جنوری تا مارچ ۲۰۰۲ء۔ص:۴۴)

قمراعظم ہاشمی کی انجمن ترقی اردو سے باضابطہ وابستگی ۱۹۶۳ء سے ہوئی۔اس تنظیم میں ان کی شمولیت کا واقعہ خودان کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

''۱۹۶۳ء میں ایک روز استاذ مرحوم ڈاکٹر اختراورینوی کے کواٹر میں غلام سرور،سید شاہ مشتاق احمد،مولانا بیتاب صدیقی،پروفیسرعبدالمغنی صاحبان سے ملنے کا

اتفاق ہوا۔یہ حضرات اردوتحریک سے متعلق مشوروں کے لیے اختر صاحب کے یہاں پہنچے تھے۔دیر تک ان کی باتیں ہوتی رہیں اورمیں خاموشی سے سنتا رہا۔زبان اردو سے متعلق متعدد مسائل سے واقفیت ہوگئی۔یہ حضرات باہر نکلے تو میں بھی کواٹر کے صحن تک آیا۔اس دوران مولانا بیتاب صدیقی نے تحریک اردو سے منسلک ہونے کی ترغیب دی۔میں تو گویا انتظار ہی میں تھا،حامی بھرلی۔تب سے انجمن ترقی اردو کا سرگرم رکن رہااور قدم قدم پر تحریک اردو کی معاونت کرتا رہا۔''

(سرسری اس جہان سے گزرے۔قمراعظم ہاشمی۔ص:۲۴)

قمراعظم ہاشمی انجمن ترقی اردو سے وابستہ ہونے کے بعد اردوتحریک میں جی جان سے جُٹ گئے۔حالانکہ اس وقت انجمن کی سرگرمیوں میں حصہ لینا قوم دشمنی کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔لیکن انھوں نے کسی خطرہ کی پروا کیے بغیر خودکو انجمن کے لیے وقف کردیا۔۱۹۶۵ء میں ریاستی انجمن ترقی اردو کے زیراہتمام پٹنہ میں ایک کنونشن منعقد ہوا،جس کی کامیابی کے لیے غلام سرور،پروفیسرعبدالمغنی،سیدشاہ مشتاق احمد،مولانا بیتاب صدیقی،تقی رحیم وغیرہ مسلسل چھوٹے چھوٹے جلسے کرتے رہے اور پٹنہ میں مقیم اردو دوستوں سے رابطہ میں مصروف رہے۔ان کاوشوں میں قمراعظم ہاشمی ہرقدم پر اپنے ان اکابرین کے شانہ بشانہ رہے۔وقت مقررہ پر کنونشن کا انعقاد ہوا،جس میں اتفاق رائے سے یہ طے ہوگیا کہ اگلے الیکشن میں بہار میں اردو کو''ایشیو'' بنایا جائے۔اسی اثنا ۱۹۶۵ء میں ہندو پاک جنگ چھڑگئی۔اس دوران انجمن سے منسلک لوگ بطور خاص نشانہ بنے۔اس واقعہ کا ذکرقبل آچکا ہے کہ جناب غلام سرورکو قید کرکے جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا گیا۔قمراعظم ہاشمی چونکہ''سنگم'' کی ادارت سے وابستہ تھے چنانچہ ان کے اورمولانا بیتاب صدیقی کے نام بھی ڈی۔آئی۔آر کا وارنٹ جاری ہوا۔مولانا بیتاب صدیقی تو گرفتار کرلیے گئے۔لیکن پروفیسراختراورینوی نے اپنے اثرورسوخ کا استعمال کرتے ہوئے ایک ذاتی مچلکہ کی بنیاد پر قمراعظم ہاشمی کا وارنٹ منسوخ کروادیا۔اس طرح ہاشمی صاحب جیل جانے سے بچ گئے اور روپوش ہوکر''سنگم'' کی ادارت اورانجمن کا کام کرتے رہے۔چندمہینوں بعد جناب غلام سرور،مولانا بیتاب صدیقی وغیرہ جب جیل سے رہا ہوئے تو پھرتحریکی سرگرمی حسب سابق شروع ہوگئی۔

۱۹۶۷ء میں بہار اسمبلی کا الیکشن ہونا تھا۔کانگریس کی مخالفت میں کئی پارٹیاں متحد ہوگئی

تھیں۔کانگریس نے چونکہ اردو کواس کا حق نہیں دیا تھا اس لیے انجمن والوں نے کانگریس کو شکست دینے اور متحدہ محاذ کو برسر اقتدار لانے کا فیصلہ کیا۔حسبِ فیصلہ ۱۹۶۷ء کے الیکشن میں انجمن ترقی اردو نے اردو زبان کے مسائل کو الیکشن ایشیو بنایا۔ریاست بھر میں حقوق اردو کے لیے ایک عوامی ماحول تیار کیا گیا۔قمر اعظم ہاشمی اس تحریک میں پیش پیش رہے۔اس تعلق سے موصوف لکھتے ہیں:

''۱۹۶۷ء کے الیکشن میں انجمن ترقی اردو نے زبان اردو کے مسائل کو الیکشن ایشیو بنایا تھا۔جیل سے رہائی کے بعد غلام سرور صاحب نے پہلی مرتبہ دربھنگہ، مدھوبنی وغیرہ علاقوں کے سفر کا پروگرام بنایا تا کہ اردو والوں کی صفوں کو منظم کیا جا سکے۔میں شریکِ سفر رہا۔چھوٹی چھوٹی نشستیں کئی جگہوں پر ہوئیں۔اس کے علاوہ مختلف علاقوں کی اہم شخصیتوں سے ملاقاتوں کا سلسلہ بھی جاری رہا۔''

(سرسری اس جہان سے گزرے۔قمر اعظم ہاشمی۔ص:۴۰)

انجمن ترقی اردو کی حکمت عملی کارگر ثابت ہوئی۔الیکشن میں کانگریس کو شکست حاصل ہوئی اوراس کی مخالف سیاسی جماعتیں کامیابی سے ہمکنار ہوئیں۔مسٹر مہامایا پرساد کی قیادت میں مختلف سیاسی جماعتوں کی متحدہ وزارت تشکیل پائی لیکن وعدہ کے باوجود اس حکومت نے بھی اردو کو اس کا حق دینے کے لیے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا۔حالانکہ حکومت کی تشکیل کے بعد گورنر کے خطبے میں اردو کو اس کا حق دینے کا ذکر ہوا،جس کے ردّعمل میں رانچی میں فرقہ ورانہ فساد بھی ہوا۔لیکن اردو کو کسی طرح کی کوئی مراعات حاصل نہیں ہوسکی اور اردو کا مسئلہ جوں کا توں برقرار رہ گیا۔بالآخر مہامایا پرساد کی وزارت اپنی مدت پوری کرنے کے قبل ہی ختم ہوگئی۔۱۹۶۹ء میں پھر وسط مدتی انتخاب ہوا۔لیکن پھر بھی کسی جماعت کو واضح اکثریت حاصل نہیں ہوسکی۔کبھی وزارت کی تشکیل ہوتی تو کبھی صدر راج نافذ ہوجاتا۔یہ سلسلہ کچھ دنوں تک چلتا رہا۔اپنے مقصد میں ناکامی کے باوجود انجمن کے لوگوں نے ہار نہیں مانی اور اردو کی تحریک جاری رہی۔دریں اثنا ۱۹۶۹ء کے اواخر میں قمر اعظم ہاشمی نے پٹنہ کو خیر باد کہہ کے مظفر پور کا رُخ کیا،لیکن انھوں نے پٹنہ کو چھوڑا تھا اردو تحریک کو نہیں چھوڑا تھا۔لہٰذا تحریک سے ان کی وابستگی مزید گہری ہوتی چلی گئی۔

۱۹۷۰ء میں اردو فارسی کے لکچرر کی حیثیت سے پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کی تقرری ایل ایس کالج ،مظفر پور (بہار یونیورسٹی) میں ہوگئی۔پٹنہ میں رہنے کے زمانے میں موصوف جناب غلام سرور،شاہ مشتاق

احمد،مولانا بیتاب صدیقی اور پروفیسر عبدالمغنی کی قیادت میں اردو تحریک کی مہم میں شریک تھے۔مظفر پور میں قیادت کی ذمہ داری انھوں نے خود اپنے کاندھوں پر لی۔یہاں انھوں نے اپنے طلبا اور احباب کی مدد سے انجمن ترقی اردو کی مہم اور اس کی رکن سازی کا کام پورے علاقے میں پھیلانے کی پُرزور جدوجہد شروع کی۔گرچہ اس مہم میں انھیں یہاں مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا،لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کی حوصلہ افزائی کے لیے جنوری ۱۹۷۲ء میں روزنامہ ''سنگم'' پٹنہ نے ہاشمی صاحب کی بہار یونیورسٹی میں تقرری کے تعلق سے ایک اداریہ بعنوان ''بہار یونیورسٹی کا مستحسن اقدام'' تحریر کیا۔اداریہ میں اس تقرری کا خیر مقدم کرتے ہوئے اخبار مذکور نے اس یقین کا اظہار کیا کہ اب شمالی بہار میں اردو تحریک زیادہ مؤثر بن کر ابھرے گی۔ایک لکچرر کی تقرری پر کسی اخبار کا اداریہ لکھنا غالبًا پہلا واقعہ تھا۔لوگوں نے دیکھا کہ اداریہ کی پیشن گوئی صحیح ثابت ہوئی۔قمر اعظم ہاشمی نے مظفر پور ضلع میں اردو تحریک کو اس قدر منظم اور مضبوط کیا کہ یہ تحریک پورے شمالی بہار میں پھیلنے لگی اور اسے وسعت ملنے لگی۔جس کی دھمک راجدھانی سمیت پوری ریاست میں سنی گئی۔

پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کو مظفر پور میں انجمن کو مضبوط کرنے کا ایک موقع اس وقت ہاتھ آیا جب انھیں ۱۹۷۲ء میں یہاں کے مشہور ادبی ادارہ ''بزمِ فیض'' کی ادبی نشست میں شرکت کا موقع ملا۔اس نشست میں کئی ادیبوں،شاعروں اور اردو دوستوں سے ان کی ملاقات ہوئی جن سے انھوں نے اردو کے مسائل پر گفتگو کی۔نقی احمد صاحب جو ''بزمِ فیض'' کے روح رواں تھے،ان کے علاوہ جمیل احمد ایڈوکیٹ،احترام الیقین،مشتاق احمد انجم اور احمد تنویر جیسے کئی اردو دوستوں اور اردو نوازوں نے اردو زبان کی حق تلفیوں کو محسوس کرتے ہوئے انجمن ترقی اردو کی تحریک کو تعاون دینے کا وعدہ کیا اور اس تحریک سے وابستہ ہوگئے۔جناب غلام سرور کی ایما پر عبدالقیوم لعل گنجوی نے قمر اعظم ہاشمی صاحب سے ملاقات کی اور اردو تحریک کو آگے بڑھانے کی کوششوں میں اپنے بھرپور تعاون کا وعدہ کیا۔قمر اعظم ہاشمی نے تحریک کو مضبوط اور منظم کرنے کے مقصد سے اپنی رہائش گاہ پر ایک مشاورتی میٹنگ منعقد کی جس میں جمیل احمد ایڈوکیٹ،عبدالقیوم لعل گنجوی،احترام الیقین،رفیق نور،احمد حسن،نور عالم خاں،ظاہر حسین شمشاد اور کئی دوسرے لوگوں نے شرکت کی اور میٹنگ میں یہ فیصلہ لیا کہ اپنی مادری زبان اردو کے جائز اور منصفانہ حقوق کے حصول کے لیے جدوجہد تیز کی جائے۔تحریک اردو سے زیادہ سے زیادہ نوجوانوں کو جوڑا جائے، جلسے

کیے جائیں، اردو آبادی کو مادری زبان کی اہمیت بتلائی جائے اورعوامی مظاہرے کے لیے بھی فضا ہموار کی جائے۔۱۹۷۲ء میں عوام کو اردو کی اہمت کا احساس دلانے کی غرض سے ''ادبی مرکز'' کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جس کی نشستیں ہاشمی صاحب کی قیام گاہ پر ہونے لگیں۔ان سرگرمیوں نے انجمن ترقی اردو کے پیغام کو شمالی بہار کے دوردراز علاقوں تک پہنچانے کا کام کیا۔اسی دوران ہاشمی صاحب نے ''بزمِ فیض'' کے سکریٹری نقی احمد صاحب کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ بزمِ فیض کے زیراہتمام ''گُل بہار ادبی انجمن کانفرنس'' منعقد کی جائے اوراس موقع پر ایک بڑا مشاعرہ بھی منعقد ہو،تاکہ اردوآبادی میں بیداری لائی جاسکے۔ جناب نقی احمد نے اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے رابطہ کی تمام تر ذمہ داری قمراعظم صاحب کے سرڈالی۔ ہاشمی صاحب نے نقی احمد صاحب کی پیش رفت اورجمیل احمد ایڈوکیٹ کے تعاون سے اس پروگرام کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کی انتھک کوشش کی۔کانفرنس حسب پروگرام منعقد ہوئی جس میں کئی اہم تجاویز منظور ہوئیں۔ یہ تجاویز مشاعرہ سے قبل پڑھ کرسنائی گئیں اورعوام کے مجمع سے اس کی تائید حاصل کی گئی۔اس کانفرنس میں پروفیسرعطا کاکوی، سہیل عظیم آبادی، مظہرامام، شکیب ایاز، سلطان اختر، احمد تبسم، ظہیرصدیقی اوردوسری کئی اہم شخصیتوں نے شرکت کی۔شمالی بہار میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی کانفرنس تھی۔مقامی سطح پراس کے اچھے اثرات مرتب ہوئے جس کے نتیجے میں اردوآبادی میں بیداری آئی۔

۱۹۷۲ء میں بہار اسمبلی کا الیکشن ہوا جس میں کانگریس پھر برسراقتدار آ گئی اور کیدار پانڈے وزیراعلیٰ بنائے گئے۔ پھر اگلے سال جولائی ۱۹۷۳ء میں جناب عبدالغفور نے وزیراعلیٰ کا منصب سنبھالا۔ان حکومتوں نے مسائل اردو کی جانب کوئی توجہ نہیں دی۔حکومت اور کانگریس پارٹی کے رویّہ سے اردوآبادی میں بے چینی بڑھتی گئی۔ چنانچہ سرکار کے رویّہ کے خلاف ۱۹۷۳ء میں احتجاج کرنے کا فیصلہ لیا گیا، جس کی شروعات مظفرپور سے کی گئی۔اس تحریک کی تفصیل پروفیسرقمراعظم ہاشمی نے اپنی تحریر ''انجمن کی ان کہی باتیں'' میں یوں لکھی ہے:

> ''جناب غلام سروراور پروفیسرعبدالمغنی کی تحریک پر میں نے یہاں اردو دوستوں کا ایک مؤثر حلقہ تیار کرلیا تھا۔اردو کے لیے سڑکوں پر آنے کا معاملہ تھا۔جلوس اور جلسے کی تاریخ کا اعلان ہوا اور میں پوری مضبوطی اوردل جمعی کے ساتھ اس پروگرام کو کامیاب بنانے میں مصروف ہوگیا۔ پروفیسراختر قادری مرحوم میری سرگرمیوں سے

پریشان بھی تھے اورخائف بھی۔ میں نے مرحوم پروفیسرقادری صاحب سے گفتگو کے دوران یہ کہا کہ میں مادری زبان کے حقوق کے حصول کے لیے سرگرم ہوں، یہ کوئی ''اینٹی نیشنل'' رجحان تو نہیں ہے۔مگر سچ یہ ہے کہ تقسیم ملک کے وقت کی آبادی اردو کا نام لینے سے گھبراتی اورڈرتی تھی۔ بہر حال میں اپنی کوششوں میں لگا رہا۔مرحوم عبدالقیوم لعل گنجوی، نورعالم خاں، احمد حسن، جمیل احمد ایڈوکیٹ، اصغراعجازی ایڈوکیٹ سرگرم معاون رہے۔ٹاؤن ہال سے جلوس نکلا اورشاہراہوں سے ہوتا ہوا ضلع مجسٹریٹ کے دفتر کے پاس ختم ہوا۔''اردو کا حق دو''، ''اردو ہندی بہنیں ہیں''، ''بہنوں میں سنگھرش نہیں'' جیسے نعرے لگائے جاتے رہے۔جناب غلام سرور، پروفیسرعبدالمغنی، سیدشاہ مشتاق احمد، جناب بیتاب صدیقی وغیرہ حضرات پٹنہ سے تشریف لائے تھے اورجلوس کی قیادت کررہے تھے۔ضلع مجسٹریٹ کو میمورینڈم دیا گیااور پھرتلک میدان میں ایک احتجاجی جلسہ ہوا۔''

(سہ ماہی ''تمثیلِ نو'' دربھنگہ۔جنوری تامارچ ۲۰۰۲ء۔ص:۴۵۔۴۶)

انجمن ترقی اردو کے زیراہتمام منعقدہ اس مظاہرہ کی کامیابی سے ارد وتحریک کو تقویت پہنچی اورقائدین اردو کے حوصلے بڑھے۔جس کے نتیجے میں انجمن کی سرگرمیاں تیز سے تیز تر ہونے لگیں۔۱۹۷۴ء کے اوائل میں مظفرپور کے اراکین انجمن کی ایک اہم میٹنگ ہاشمی صاحب کی قیام گاہ پر ہوئی۔جس میں گذشتہ کارکردگیوں کا جائزہ لینے کے بعد اتفاق رائے سے یہ فیصلہ لیا گیا کہ مظفرپور میں ''گُل بہار اردو کانفرنس'' منعقد کی جائے۔یہ تجویز لے کر قمراعظم صاحب پٹنہ پہنچے۔وہاں انھوں نے اس سلسلہ میں مولانا بیتاب صدیقی، جناب غلام سرور، سیدشاہ مشتاق احمداور پروفیسرعبدالمغنی صاحبان سے مشورے کیے۔تمام قائدین نے کانفرنس کے انعقاد کی تجویز کی تائید کی۔مولانا بیتاب صدیقی نے یہ تجویز ریاستی انجمن کی مجلس عاملہ میں پیش کی، جومنظور کرلی گئی۔ریاستی انجمن کی ہدایات کے مطابق انجمن کی مظفرپور شاخ نے اپنی سرگرمیاں تیز کردیں۔مظفرپور کے احباب انجمن میں عبدالقیوم لعل گنجوی، جمیل احمد ایڈوکیٹ، احترام الیقین، اکرام الحق (کھیا)، سمیع الزماں ایڈوکیٹ، نورعالم خاں، احمدحسن اورکونین اختر وغیرہ پہلے ہی سے سرگرم عمل تھے۔قمراعظم ہاشمی کی تحریک پر سیدافتخار احمد ایڈوکیٹ، محمد سلیم اللہ، ولی احمد ولیؔ، جلال

اصغرفریدی،ممتاز احمد(چرم تاجر)اورکئی دوسرے حضرات بھی تحریک اردو سے منسلک ہوئے۔رائے عامہ کے ہموار ہونے کے بعد''مسلم کلب''مظفر پور میں استقبالیہ کمیٹی کی تشکیل کے لیے ایک اہم نمائندہ اجلاس منعقد کیا گیا۔پروفیسر اختر قادری کو استقبالیہ کمیٹی کا صدر،قمر اعظم ہاشمی کو سکریٹری اور جمیل احمد ایڈوکیٹ کو خازن بنایا گیا۔۱۹۷۵ء میں ریاستی انجمن ترقی اردو کا سالانہ اجلاس اور مشاعرہ ہونا طے پایا تھا۔اس موقع سے انجمن کی صوبائی کمیٹی کا انتخاب بھی ہونا تھا۔چنانچہ کئی ماہ قبل سے ہی ضلعی کانفرنسوں کا سلسلہ شروع ہوا۔تاکہ ہر ضلع سے اردو والوں کی شرکت یقینی بنائی جاسکے۔اس موقع پر سیتا مڑھی،موتیہاری،گوپال گنج،دربھنگہ اور مدھوبنی وغیرہ جگہوں کی کانفرنس کے لیے مختلف وفود تیار کیے گئے۔مدھوبنی کانفرنس کے لیے جو وفد تیار ہوا اس میں غلام سرور صاحب کے علاوہ جمیل احمد ایڈوکیٹ،زین العابدین اور قمر اعظم ہاشمی بھی شامل تھے۔مظفر پور سے مغرب کے وقت یہ قافلہ مدھوبنی کے لیے روانہ ہوا اور راستے میں ہی حادثہ کا شکار ہو گیا۔اس حادثہ کی تفصیل ہاشمی صاحب نے اپنی خودنوشت میں یوں رقم کی ہے:

''مغرب کے وقت یہ قافلہ کار سے روانہ ہوا۔آگے بائیں طرف غلام سرور صاحب تھے۔پیچھے میں تھا۔ایک طرف جمیل بھائی دوسری طرف زین العابدین تھے۔گاڑی(ایمبیسڈر)خستہ حال تھی۔اعتبار پور پہنچتے پہنچتے اندھیرا پھیل چکا تھا۔شرف الدین پور کی طرف گاڑی بڑھ رہی تھی کہ اچانک گاڑی کا بریک فیل ہو گیا۔فوراً ہی روشنی نے کام کرنا بند کر دیا۔گاڑی سرپٹ بھاگ رہی تھی۔ڈرائیور کے پسینے چھوٹنے لگے۔ہم لوگوں کے ہوش اُڑ گئے۔میں نے کلمہ کا ورد شروع کر دیا۔تھوڑی ہی دیر میں گاڑی کو ایک شدید جھٹکا لگا اور یہ گنّے کے ایک کھیت میں لڑھکتی چلی گئی۔میں نے محسوس کیا کہ آگے کا بایاں دروازہ کھُلا اور اچانک کوئی چیز دھپ سے گری۔تھوڑی دور تک رینگنے کے بعد گاڑی ایک دھچکے کے ساتھ رُک گئی۔دائیں بائیں ٹٹول کر دیکھا دونوں موجود تھے۔آگے کی بائیں سیٹ ٹٹولی،غلام سرور نہیں تھے۔میں فق رہ گیا۔میں نے پوری قوت یکجا کر کے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ دروازہ کھولیے،اتریے،غلام سرور نہیں ہیں۔اترتے ہی اضطراری کیفیت کے ساتھ رات کے اندھیرے میں چیخنے

لگا''غلام سرور''''غلام سرور''۔کہیں دور سے آواز آئی۔''قمر اعظم ہاشمی میں یہاں ہوں۔''آواز ملی تو ڈھارس بندھی اور ہم لوگ آواز کی سمت میں بڑھنے لگے۔اسی دوران قریبی گاؤں سے کچھ لوگ لالٹین اور لاٹھیاں لیے ہوئے آتے دکھائی دیے۔قریب پہنچے تو لوگوں نے لالٹین اٹھا کر چہرے دیکھے۔''ارے یہ تو سر ہیں،ہاشمی سر''۔کالج کا طالب علم تھا۔میں نے کہا''مجھے چھوڑو،دیکھو غلام سرور صاحب کدھر ہیں۔''میں نے پھر''سرور صاحب سرور صاحب''ہانک لگائی،پھر جواب ملا''قمر اعظم یہاں ہوں''۔لالٹین کے سہارے ہم لوگوں نے ان کو جالیا۔معلوم یہ ہوا کہ خطرہ محسوس کرتے ہی انھوں نے دروازہ کھول کر چھلانگ لگادی تھی۔اللہ نے حفاظت کی۔ہم سب مجموعی طور پر محفوظ رہے اور''شہیدانِ اردو''ہوتے ہوتے بچے۔سرور صاحب کو خراشیں آگئی تھیں۔خون رس رہا تھا۔بائیں طرف کا کُرتا پھٹ گیا تھا۔زین العابدین کا ایک دانت ٹوٹ گیا تھا۔جمیل بھائی کے گھٹنے میں چوٹ آئی تھی۔میرا بھی ٹخنا مجروح ہوا تھا۔میں نے کہا یہ رکاوٹ قدرت کی طرف سے ہے،واپس مظفر پور چلنا بہتر ہے۔اسی گاڑی سے نصف شب کے بعد مظفر پور واپس پہنچ گئے۔''

(''سرسری اس جہان سے گزرے''۔قمر اعظم ہاشمی۔ص:۶۲۔۶۳)

حادثے کا شکار ہونے کے باوجود مجاہدین اردو نے ہمت نہیں ہاری اور مقررہ تاریخ کو کانفرنس کے انعقاد کی تگ ودو میں لگے رہے۔اس وقت مظفر پور اور پٹنہ کے درمیان اسٹیمر کا راستہ تھا۔ہاشمی صاحب کانفرنس کے پوسٹرس اور ہینڈ بلز کے پُلندے کاندھے پر لاد کر اسٹیمر سے ٹرین پر لاتے اور صبح سویرے مظفر پور پہنچ کر ان پوسٹروں اور ہینڈ بلوں کو شمالی بہار کے تمام اضلاع میں بھیجتے۔اس طرح محبّانِ اردو کے پُرخلوص تعاون سے انجمن کا پیغام تمام گلی کوچوں،مدرسوں اور اسکولوں میں پہنچتا رہا۔۲۶/اپریل ۱۹۷۵ء کو مظفر پور کے ٹاؤن ہال میں بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کا مجوزہ سالانہ اجلاس اور انتخاب ہونا تھا۔جس میں کونسلروں کے ذریعہ صدر اور سکریٹری کا انتخاب بھی ہونا تھا۔تاریخ مذکور سے قبل ہی مظفر پور میں قائدین اردو کے قافلوں کے آنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کے مطابق سب سے پہلے پٹنہ سے جو

قافلہ مظفر پور پہنچا اس میں سید شاہ مشتاق احمد، مولانا بیتاب صدیقی اور غلام سرور صاحبان شامل تھے۔ جب کہ دوسرے قافلے میں پروفیسر عبدالمغنی کے علاوہ پروفیسر مظفر اقبال، پروفیسر ابوذر عثمانی، پروفیسر احمد سجاد، شکیب ایاز، شبیر احمد، نجیب اختر، رسول اختر، منظور نعمانی وغیرہ شامل تھے۔ ڈاکٹر خلیق انجم کل ہند جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو، دہلی سے تشریف لا چکے تھے۔ اس طرح کونسلروں کے علاوہ محبانِ اردو کی ایک بڑی تعداد کانفرنس میں شرکت کے لیے مظفر پور پہنچ گئی تھی۔ لوگوں میں حد درجہ جوش وخروش تھا۔ دس بجے دن ڈیلی گیٹ سیشن کا آغاز ہوا۔ اہم تجاویز اتفاق رائے سے منظور ہوگئیں۔ تجاویز کی منظوری کے بعد صدر کے انتخاب کی کارروائی شروع ہوئی۔ صدر کے عہدے کے لیے دو نام پیش ہوگئے۔ ایک غلام سرور صاحب کا اور دوسرے پروفیسر عبدالمغنی صاحب کا۔ جیسے ہی الیکشن کی تیاری ہونے لگی اجلاس کا ماحول گرم ہوگیا۔ صدر کی امیدواری کے تعلق سے کونسلرز دو خیموں میں بٹ گئے۔ ان میں ایک گروپ غلام سرور کا اور دوسرا گروپ پروفیسر عبدالمغنی کا حامی ہوگیا۔ اس صورتحال کو دیکھتے ہوئے بعض حضرات نے یہ تجویز پیش کی کہ الیکشن سے گریز کیا جائے اور انتخاب ثالثی سے ہوجائے تو بہتر ہوگا۔ اس واقعہ کا ذکر پروفیسر قمر اعظم ہاشمی نے اپنے مضمون ''انجمن کی ان کہی باتیں'' میں بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''تجاویز کے اجلاس ہی میں جناب غلام سرور اور پروفیسر عبدالمغنی کا نظریاتی اختلاف نمایاں ہوگیا۔ دونوں حضرات عہدۂ صدر کے امیدوار تھے۔ میرا رابطہ دونوں ہی حضرات سے تھا۔ میں اس کوشش میں تھا کہ مفاہمت کی کوئی راہ نکل جائے، ہنگامہ آرائی نہ ہو۔ خون خرابہ نہ ہو۔ اس سے اردو مخالف کیمپ میں چراغاں ہوگا۔ پروفیسر اختر قادری صاحب انتخابی اجلاس کے صدر تھے۔ میں نے ہی ان کا نام تجویز کیا تھا اور پروفیسر عبدالمغنی اور غلام سرور صاحبان نے اس کی تائید کی تھی۔ انتخابی اجلاس کے وقت ایوان کی گرمی کو دیکھ کر پروفیسر اختر قادری صاحب کچھ پریشان سے ہوگئے۔ میں نے عین اجلاس کے وقت پروفیسر اختر قادری صاحب سے مشورہ کیا کہ اگر یہ حضرات کسی کو ثالث مان لیں تو گاڑی نکل جائے گی۔''
>
> (سہ ماہی ''تمثیلِ نو'' دربھنگہ۔ جنوری تا مارچ ۲۰۰۲ء۔ ص: ۴۷)

پروفیسر اختر قادری نے دونوں ہی امیدواروں سے گفت وشنید کی اور ہاشمی صاحب کی تجویز پر

ثالث کی حیثیت سے ڈاکٹر ظفر حمیدی کا نام پیش کیا۔ ڈاکٹر ظفر حمیدی کو ثالث بننے کے لیے تیار کرنے کی ذمہ داری قمر اعظم ہاشمی صاحب پر سونپی گئی۔ بدقت تمام ظفر حمیدی صاحب ثالثی کے لیے آمادہ ہوئے۔ جلسہ گاہ میں ان کے پہنچنے کے بعد صدر جلسہ اور صدر کے عہدے کے دونوں امیدواروں نے انھیں یقین دلایا کہ ثالث کی حیثیت سے وہ جو بھی فیصلہ دیں گے اسے سبھی قبول کریں گے۔ غلام سرور صاحب اور پروفیسر عبدالمغنی صاحب دونوں نے یکے بعد دیگرے ثالث کے فیصلے کو تسلیم کرنے کا اعلان کردیا۔ بقول ڈاکٹر ریحان غنی: ''الحاج غلام سرور اس وقت اتنے جذباتی ہوگئے تھے کہ انھوں نے اپنی جیب سے پنج سورۃ نکال کر ثالث کی بات ماننے کا اعلان کردیا۔ اس کے بعد کے احوال قمر اعظم ہاشمی کے الفاظ میں ملاحظہ ہوں:

> ''ڈاکٹر ظفر حمیدی صاحب مائک پر تشریف لائے، انھوں نے قرآن حکیم کی چند آیات تلاوت کیں اور مختصر سی تمہیدی تقریر کی۔ اس سے پہلے انھوں نے استخارہ دیکھا، فال نکالی، مگر اسے پوشیدہ رکھا تھا اور تب انھوں نے صدر کی حیثیت سے پروفیسر عبدالمغنی کے نام کا اعلان کردیا۔ ابھی سکریٹری کے نام کے انتخاب کا اعلان باقی ہی تھا کہ ہنگامے شروع ہوگئے۔ کرسیاں اٹھا اٹھا کر پھینکی جانے لگیں اور دونوں طرف کے حامیوں میں تصادم کا ماحول پیدا ہوگیا اور بھگدڑ مچ گئی۔ جلسہ گاہ سے مندوبین بھاگنے لگے۔ پانچ بجے شام تک جلسہ گاہ خالی ہوگیا۔ اب شام کے عوامی اجلاس کا انتظام کرنا تھا اور آرگنائزنگ سکریٹری کی حیثیت سے میری ذمہ داری یہ بھی تھی کہ شب کے مشاعرہ کے انعقاد کا پروگرام بھی کامیابی کے ساتھ انجام پذیر کرایا جائے۔ میں ایک گھنٹے کے لیے اپنی قیام گاہ کی طرف روانہ ہوا، مظفر پور کے چند رفیقانِ انجمن بھی ساتھ تھے۔ تلک میدان روڈ کے قریب مجھ پر چھُرے سے حملہ ہوا، مگر محفوظ رہا۔''
>
> (سہ ماہی ''تمثیلِ نو'' دربھنگہ۔ جنوری تا مارچ ۲۰۰۲ء۔ ص: ۴۸)

حسبِ پروگرام بعد نماز مغرب کھلے اجلاس کا انعقاد ہوا جس کی صدارت انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم نے فرمائی۔ اس اجلاس میں منظور شدہ تجاویز پڑھ کر سنائی گئیں۔ جس کی

تائید سامعین نے اپنے ہاتھ اُٹھا کر کی۔غلام سرورصاحب اور پروفیسرعبدالمغنی صاحب نے اس اجلاس میں شرکت نہیں کی۔البتہ انجمن کی بہار شاخ کے سکریٹری مولانا بیتاب صدیقی اس موقع پر موجود تھے۔اس اجلاس کا اختتام ۹ ربجے شب میں ہوااوراس کے بعدمشاعرہ کا دورشروع ہوا جورات بھر جاری رہا۔

مظفرپور کے اس انتخابی اجلاس کے بعد انجمن ترقی اردو ،بہار دو حصّوں میں تقسیم ہوگئی۔پروفیسرعبدالمغنی کی قیادت والی انجمن کا نام ''انجمن ترقی اردو، بہار'' ہوااور غلام سرور کی سربراہی والی انجمن کا وہی پُرانا نام یعنی ''بہار ریاستی انجمن ترقی اردو'' ہی رہا۔پروفیسرعبدالمغنی نے صدر کی حیثیت سے اپنی مجلس عاملہ تشکیل دی،جس میں کلام حیدری جنرل سکریٹری اور ہارون رشید خازن بنائے گئے۔جمیل احمد ایڈوکیٹ (مظفر پور)، پروفیسرابوذرعثمانی (رانچی) اور پروفیسرمظفراقبال (بھاگلپور) اس کے نائب صدور مقرر ہوئے۔قمراعظم ہاشمی نے کوئی بھی عہدہ قبول کرنے سے انکار کردیا اور کہا کہ میرے لیے ریاستی مجلس عاملہ کی رکنیت ہی کافی ہے۔غلام سرورگروپ نے انتخاب کو کالعدم قرار دینے کے لیے پٹنہ ہائی کورٹ میں مقدمہ دائر کیا۔عدالت کا فیصلہ پروفیسرعبدالمغنی کے حق میں ہوا۔یہ فیصلہ آنے کے بعد انجمن ترقی اردو بہار کی مجلس عاملہ کا جلسہ ۲۳رمئی ۱۹۷۷ء کو گورنمنٹ اردو لائبریری، پٹنہ کی بالائی منزل میں ہوا،جس میں اراکین مجلس عاملہ نے انتخاب اور کمیٹی کی تشکیل پر اپنے فیصلے کی مہر لگادی۔ادھر انجمن ترقی اردو ہند نے بھی اس فیصلے کی توثیق کردی۔چونکہ انجمن ترقی اردو ہند نے انجمن ترقی اردو بہار کو اپنی منظوری دے دی تھی اس لیے حکومت بہار نے بھی عبدالمغنی صاحب کی قیادت والی انجمن کو ہی تسلیم کیا اور سرکاری گرانٹ کی رقم بھی اسی انجمن کو ملنے لگی۔اس کے بعد غلام سرور کی قیادت والی انجمن رفتہ رفتہ غیر متحرک ہوتی چلی گئی۔جبکہ عبدالمغنی صاحب کی قیادت والی انجمن میں جو کارواں بنا اس نے اردو کے حقوق کی بازیابی کے لیے اپنی جدوجہد تیز کردی۔

جون ۱۹۷۵ء میں ملک میں ایمرجنسی نافذ کردی گئی جو تقریباً دو برسوں تک قائم رہی۔اس مدت میں حزب مخالف کے بے شمار رہنما اسیرزنداں کردیے گئے اور بہت سارے لیڈران روپوش بھی ہوگئے۔غلام سرورصاحب بھی روپوش ہوگئے۔لیکن پروفیسرعبدالمغنی کی قیادت میں انجمن کی سرگرمیاں جاری رہیں،گرچہ انجمن والوں کی نگرانی بھی کی جارہی تھی۔۱۹۷۷ء میں ایمرجنسی ختم ہونے کے بعد پارلیمانی انتخابات ہوا جس میں کانگریس پارٹی کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔حتّٰی کہ وزیراعظم اندرا گاندھی

بھی الیکشن ہار گئیں۔ملک کی قیادت مرارجی دیسائی کے ہاتھوں میں آ گئی جنھوں نے اپنے مختصر دورِحکومت میں ملک کی اقلیتی آبادی کو مایوس ہی کیا۔غلام سرورصاحب چونکہ کانگریس مخالف تھے اس لیے جئے پرکاش نارائن کی کانگریس مخالف تحریک کے دوران ان سے بھرپور تعاون لیا گیا۔ایمرجنسی کے خاتمے کے بعد جب بہار میں غیر کانگریسی حکومت کی تشکیل عمل میں آئی تو غلام سرور صاحب کو صوبائی وزارت میں وزیر کابینہ بنایا گیا۔اس طرح غلام سرور صاحب بہار کی اردو تحریک سے عملی طور پر کنارہ کش ہوگئے۔

حالات کے پیش نظر پروفیسرعبدالمغنی نے انجمن کی عاملہ کا جلسہ طلب کیا،جس میں متفقہ طور پر فیصلہ ہوا کہ پارلیمنٹ کے وسط مدتی انتخابات (۱۹۸۰ء) میں انجمن کے ارکان وعہدیداران کے ساتھ ساتھ اردو آبادی اسی جماعت کی حمایت کرے گی جو اردو کو اس کے جائز حقوق دینے اور اقلیتی طبقے کے تئیں منصفانہ رویّہ اختیار کرنے کا وعدہ کرے۔ہاشمی صاحب کے مطابق کانگریس کے علاوہ کسی سیاسی جماعت نے اپنے انتخابی منشور میں کسی مثبت اور واضح وعدے کا اعلان نہیں کیا۔حالانکہ غلام سرورصاحب کی قیادت والی انجمن کانگریس مخالف پارٹیوں کی حمایت کر رہی تھی۔کانگریس نے اپنے انتخابی منشور میں اعلان کیا کہ پارٹی اگر اقتدار میں آئی تو بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ بھی دے گی اور اقلیتی آبادی کے دوسرے مسائل بھی حل کرنے کی کوشش کرے گی۔کانگریس کی اس یقین دہانی پر پروفیسرعبدالمغنی کی قیادت والی انجمن نے اعتماد کیا اور انجمن کی مجلس عاملہ نے متفقہ طور پر کانگریسی امیدواروں کو کامیاب بنانے کا فیصلہ کیا۔اس وقت غلام سرورصاحب کے بجائے پروفیسرعبدالمغنی صاحب کی اردو آبادی پر پکڑ زیادہ تھی۔مغنی صاحب کے ساتھ معلمین ومدرسین کے علاوہ اردو طلبا بھی شامل تھے۔اساتذہ میں پروفیسرقمراعظم ہاشمی جیسے مخلص اور جانثار اردو بھی شامل تھے جنھوں نے اردو تحریک کو مضبوط بنانے اور اردو کا حق حاصل کرنے کے لیے اپنے سر سے کفن باندھ رکھا تھا۔الیکشن میں کانگریس کو کامیاب کرنے کے لیے صدر انجمن پروفیسرعبدالمغنی نے بہار بھر کے دوڑے کیے۔تقریروں، پوسٹروں اور ہینڈ بلوں کے ذریعہ اردو عوام میں بیداری کی لہر پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی۔شمالی بہار کے دورے میں پروفیسرقمراعظم ہاشمی،عبدالمغنی صاحب کے ساتھ ساتھ رہے اور انھوں نے تحریک کے رفیق کار جمیل احمد ایڈوکیٹ کو بھی ساتھ ساتھ رکھا۔انجمن کی پالیسی کو مدنظر رکھتے ہوئے اس موقع سے پروفیسرقمراعظم ہاشمی نے ایک مضمون بعنوان ''ہم کو ان سے وفا کی ہے امید'' لکھا جو مختلف اخباروں میں شائع ہوا۔اردو آبادی میں موصوف کی اس تحریر کا

اچھا اثر پڑا۔اردوآبادی نے کانگریس کے انتخابی منشور پر بھروسا کرتے ہوئے کانگریس کو اپنا تعاون دیا اور یہ پارٹی مرکز میں بھی حکومت تشکیل دینے میں کامیاب ہوئی اور ریاست بہار میں بھی۔مرکز میں محترمہ اندرا گاندھی کی قیادت میں حکومت کی تشکیل عمل میں آئی جبکہ بہار میں (۱۹۸۰ء)ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا وزیراعلیٰ منتخب کیے گئے۔اس انتخابی نتیجے نے حزبِ مخالف کی سیاسی جماعتوں کو یہ احساس دلایا کہ اقلیتی طبقہ اب اپنے حقوق کے تعلق سے بیدار ہو چکا ہے۔انجمن ترقی اردو بہار کی مجلس عاملہ نے صدرانجمن پروفیسر عبدالمغنی کوکُلی اختیار دیا کہ وہ انجمن کے مطالبات کو منتخبہ حکومت کے سامنے رکھیں۔پروفیسر قمراعظم ہاشمی کے مطابق ”صدرانجمن نے حقوق اردو کے حصول کے مدنظر ایک جامع میمورنڈم تیار کیا اور ایک مؤثر وفد کی قیادت کرتے ہوئے وزیراعلیٰ ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا کے سامنے اردو کے مسائل کو رکھا۔عرضداشت میں ان وعدوں کو یاد دلایا گیا تھا جو الیکشن سے قبل کانگریس نے اردو آبادی سے کیا تھا۔ان میں بنیادی مسئلہ تو یہ تھا کہ زبان اردو کو ثانوی سرکاری حیثیت ملے۔پھر یہ کہ بہار اردو اکادمی کا مسئلہ تھا۔جس کی تشکیل انجمن ترقی اردو ہی کی پُرزور کاوش سے ہوئی تھی۔دینی مدارس کے سامنے بھی بہت سی الجھنیں تھیں۔بہرنوع ان تمام مسائل کی روشنی میں صدرانجمن نے وزیراعلیٰ کے سامنے اپنے مطالبات رکھے۔وزیراعلیٰ ان مطالبوں کے حامی تھے اور اردو کو اس کا جائز حق دینا چاہتے تھے۔مگر مخالف سیاسی پارٹیوں کو ان مسائل سے دل چسپی نہیں تھی۔کانگریس پارٹی میں بھی بعض ایم۔ایل۔اے ایسے تھے جو اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کے حمایتی نہیں تھے۔اس لیے ڈاکٹر مشرا بھی پش وپیش کی کیفیت میں مبتلا تھے۔چنانچہ وہ اپنا وعدیٰ نبھانے میں قیل وقال کرنے لگے۔اراکین اسمبلی کے بعض لوگ پروفیسر عبدالمغنی کو کوئی نمائشی عہدہ دے کر انھیں خاموش کر دینا چاہتے تھے۔لیکن مغنی صاحب کو رام کرنا ناممکنات میں تھا۔پروفیسر عبدالمغنی عہدہ کی خاطر اردو تحریک کو کمزور نہیں کر سکتے تھے۔انھوں نے تحریک جاری رکھی اور اجتماعی مفادات کے حصول کی سرگرمیوں کو تیز سے تیز تر کرنے میں مصروف ہو گئے۔پروفیسر قمراعظم ہاشمی کے مطابق عبدالمغنی صاحب کی قیادت میں تحریک اردو کے وفود نے بہار پردیش کانگریس کمیٹی کے صدر مسٹر رفیق عالم اور کابینہ وزیر مسٹر نصیرالدین حیدر خاں سے کئی ملاقاتیں کیں۔انجمن کی معاونت سے جیتنے والے اراکین اسمبلی سے بھی گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔مسلسل یہ کوشش کی جاتی رہی کہ یہ حضرات ڈاکٹر مشرا کو صحیح مشورہ دیں اور دباؤ بنائیں کہ انتخابی وعدے پورے کیے جائیں۔ان کوششوں کے باوجود ڈاکٹر مشرا تذبذب کے شکار

رہے۔بالآخر ستمبر ۱۹۸۰ء کے آغاز ہی میں انجمن نے یہ فیصلہ لیا کہ حکومت کو آخری بار ایک میمورینڈم دیا جائے اور اس میں وضاحت کی جائے کہ دو مہینوں کے اندر اگر یہ وعدے پورے نہیں ہوئے تو انجمن حکومت مخالف تحریک شروع کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔صدرانجمن کی قیادت میں ایک وفد نے ڈاکٹر مشرا صاحب سے ملاقات کر کے اپنی باتیں پھر ان کے سامنے رکھیں۔ڈاکٹر مشرا پر دباؤ ڈالنے کے لیے صدرانجمن نے دوسری جانب بیداری مہم چھیڑنے کا بھی فیصلہ لیا۔قائدین انجمن نے بہار بھر کا طوفانی دورہ کیا۔آغاز مظفرپور سے ہوا۔۱۴؍اکتوبر ۱۹۸۰ء کو صدرانجمن نے مظفرپور کے ”مسلم کلب“ میں ایک عوامی جلسے سے خطاب کیا۔پروگرام کی تیاریوں کی ذمہ داری پروفیسر قمراعظم ہاشمی کے ذمہ ڈالی گئی۔ان کے ساتھ ان کے شاگردوں ڈاکٹر ظاہر حسین شمشاد، سید رضی حیدر، محمد سلیم اللہ، ولی احمد ولؔی، جمال ناصر، جلال اصغر فریدی جیسے نوجوان اسکالرس نے اس جلسے کو کامیاب بنانے کی ہر ممکن کوشش کی۔صدرانجمن نے اس جلسے میں تفصیل کے ساتھ تمام حالات اور اس کے نشیب وفراز پر روشنی ڈالی۔اس کے بعد اتفاق رائے سے یہ تجویز منظور کی گئی کہ حکومت نے انتخابی منشور میں جو وعدے کیے تھے اسے پورا کریں، ورنہ احتجاجات کا سلسلہ شروع کر دیا جائے گا۔گورنر اور وزیراعلیٰ دونوں کو ٹیلی گرام اور خطوط بھیجنے کے لیے اس نوعیت کا مضمون تیار کر لیا گیا اور تمام تفصیلات اردو آبادی کو بذریعہ اخبارات بتا دی گئیں۔اس دوران صدرانجمن سے وزیراعلیٰ کی بات چیت بھی ہوتی رہی۔بالآخر بھارتیہ نرتیہ کلا مندر، پٹنہ میں جلسہ ہوا۔صدرانجمن بھی بلائے گئے۔بقول قمراعظم ہاشمی ”ڈائس پر وزیراعلیٰ اور صدرانجمن ایک دوسرے سے آنکھ ملانے سے گریز کرتے رہے۔“ اسی جلسے میں وزیراعلیٰ نے زبان اردو کو بہار کی ثانوی سرکاری زبان بنانے کا اعلان کیا۔صدرانجمن پروفیسر عبدالمغنی کی آنکھیں خوشی سے نم ہو گئیں اور وزیراعلیٰ نے انھیں گلے لگا لیا۔۱۹؍نومبر ۱۹۸۰ء کو وزیراعظم ہند محترمہ اندرا گاندھی کی سالگرہ کے موقع پر زبان اردو کو ریاست بہار کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے دیا گیا۔جس کا نوٹیفیکیشن بھی جاری کر دیا گیا۔اردو کے حقوق کی اس حصولیابی کی خوشی میں انجمن ترقی اردو کے زیراہتمام ”رام موہن رائے سمینری“ میں اردو عوام کا عظیم الشان جلسہ ہوا۔پروفیسر قمراعظم ہاشمی کی تحریک پر مظفرپور اور شمالی بہار سے لوگوں کی ایک کثیر تعداد وہاں پہنچی۔اس کے علاوہ بہار کے مختلف علاقوں سے بسوں اور ٹرینوں سے سفر کر کے ہزاروں کی تعداد میں لوگ وہاں پہنچے، جہاں ڈاکٹر مشرا کا زبردست استقبال کیا گیا۔صدرانجمن نے ڈاکٹر مشرا کو ”محسنِ اردو“ صدر کانگریس رفیق عالم کو ”رفیقِ

اردو‘‘اور کابینہ وزیر راجہ نصیرالدین حیدر خاں کو ’’نصیرِ اردو‘‘ سے خطاب کیا۔واضح ہو کہ بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دلانے میں جناب رفیق عالم اور راجہ نصیرالدین حیدر خاں کی زبردست کوششیں شامل رہی تھیں۔اس استقبالیہ جلسے میں عوام کی طرف سے یہ گزارش بھی کی گئی کہ وزیر اعلیٰ ایکٹ بنوا کر ایوانوں سے اسے منظور کرالیں تاکہ مستقبل میں کوئی اردو مخالف سازش نہ ہو۔ڈاکٹر مشرا نے اپنی تقریر کے دوران اس کا وعدہ کیا اور انھوں نے اپنے اس وعدہ کو پورا بھی کر دیا۔جنوری ۱۹۸۱ء میں منعقدہ بہار اسمبلی کے اجلاس میں دستور کی دفعہ ۳۴۵ر کے تحت ۱۹۵۱ء کے آفیشل لینگویجز ایکٹ (Official Languages Act) میں ایک ترمیمی بل کے ذریعہ بہار آفیشیل لینگویجز (ایمنڈمنٹ) ایکٹ ۱۹۸۱ء بہار اسمبلی سے منظور ہوا اور اس کی رو سے بہار کے پندرہ اضلاع میں زبان اردو کے سرکاری استعمال کے لیے گزٹ نوٹیفیکیشن جاری کر دیا گیا۔ڈاکٹر مشرا نے بڑی جرأت اور ہمت کے ساتھ انتخابی منشور کے وعدے کی تکمیل کر کے اردو عوام کے لسانی جذبات کی تکمیل اور تسکین کی جس میں یقیناً وزیر اعظم ہند محترمہ اندرا گاندھی کی مرضی اور منظوری بھی شامل تھی۔

حقوق اردو کے حصول کی تحریک سے لے کر قانون اردو کے نفاذ تک ہر مرحلے میں پروفیسر قمر اعظم ہاشمی نے نمایاں اور سرگرم حصّہ لیا اور ہمیشہ ایک مجاہد کے رول میں رہے۔انھوں نے ۱۹۶۳ء سے ۱۹۸۰ء تک بہار کی اردو تحریک کی تمام مہموں میں سرگرم کردار ادا کیا۔چنانچہ تحریکِ اردو کی تاریخ کا ہر صفحہ ان کی خدمات اور قربانیوں کے گواہ ہیں۔اپنی نمایاں خدمات کے باوجود انھوں نے اس پلیٹ فارم کو کبھی بھی اپنی شہرت کا ذریعہ نہیں بنایا۔کبھی کسی عہدے کی چاہت نہیں کی اور ہمیشہ ایک بے لوث اور مخلص خادم کی طرح ہی تنظیم سے منسلک رہے۔انھوں نے عہدے کی خاطر نہ کبھی کسی باغیانہ سرگرمیوں میں حصہ لیا ،نہ عہدہ پانے کے لیے کوئی جوڑ توڑ کی اور نہ اپنے قائد کے ساتھ کبھی کوئی بے وفائی کی۔وہ ہمیشہ انجمن کے ایک وفادار سپاہی بن کر تنظیم کے لیے وقف رہے۔انجمن سے چالیس سال کی وابستگی کے باوجود موصوف صوبائی سطح پر کیا ضلعی سطح پر بھی انجمن کے کسی اہم عہدے پر فائز نہیں رہے۔لیکن اپنی خدمات سے انجمن کو فیض پہنچاتے رہے۔پروفیسر ہاشمی کی اس بے غرضی ، بے لوثی اور ایثار پسندی کے تعلق سے ڈاکٹر منظر اعجاز نے ایک جگہ لکھا ہے:

’’پروفیسر قمر اعظم ہاشمی اردو کے بے لوث خادم، مرد مجاہد اور بہار میں اردو تحریک کے

روح رواں تھے۔لیکن بادشاہ گر (KING MAKER) کی طرح وہ اس تحریک و تنظیم کے محض ممبر ہی رہے۔کبھی نہ نام و نمود کے خواستگار ہوئے نہ کسی پندارِ انا کے شکار رہے۔دردِ ملّت اور غمِ اردو کو جس سلیقے سے انھوں نے اپنے دل میں جگہ دی وہ انھی کا کام تھا۔‘‘

(سہ ماہی ’’اصنافِ ادب‘‘ مظفر پور، قمر اعظم ہاشمی نمبر۔ص:۴۹)

پروفیسر قمر اعظم ہاشمی عہدے اور منصب کو کیسے جھٹکتے رہے اس کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ ۱۹۹۶ء میں منعقدہ انجمن کے صوبائی انتخاب کے موقع پر انجمن کی مجلس عاملہ کے کچھ اراکین نے جنرل سکریٹری کے عہدہ کے لیے قمر اعظم ہاشمی کا جب نام پیش کیا، تو ہم لوگوں میں سے بیشتر کی یہ خواہش تھی کہ وہ اس عہدہ کی ذمہ داری سنبھالیں۔لیکن موصوف کو جیسے ہی یہ معلوم ہوا کہ سید رضی حیدر (سابق ایڈیٹر روزنامہ صدائے عام، پٹنہ) بھی اس عہدہ کے امیدوار ہیں تو ہاشمی صاحب نے فوراً اپنا نام واپس لے لیا۔مجلس عاملہ کی اس تشکیل میں ہاشمی صاحب بحیثیت رکن عاملہ نامزد کیے گئے اور وہ اسی میں خوش تھے۔

ہاشمی صاحب کو پہلی دفعہ ۲۰۰۶ء میں انجمن ترقی اردو ،مظفر پور کے صدر کی ذمہ داری سونپی گئی۔یہ زمانہ ان کی سخت علالت کا تھا۔ان کی صحت ان کا ساتھ نہیں دے رہی تھی اور وہ عمر کی اس منزل میں بھی پہنچ چکے تھے جہاں ان سے بڑی توقعات وابستہ نہیں کی جا سکتی تھیں۔لیکن اردو اور تنظیم کی محبت میں انھوں نے یہ عہدہ صرف اس لیے قبول کر لیا کہ اردو کے لیے قربانی دینے کا جذبہ رکھنے والوں کا اس وقت مظفر پور میں فقدان ہو چکا تھا۔بادلِ نخواستہ انھوں نے یہ عہدہ قبول کر لیا اور انجمن کی ضلعی شاخ مظفر پور کو ایک بار پھر متحرک اور فعال بنانے کی کوشش شروع کی۔لیکن ان کی مسلسل علالت نے انھیں زیادہ کام کرنے کا موقع نہیں دیا۔

۲۰۰۴ء میں انجمن ترقی اردو بہار جب تنازعہ کا شکار ہوئی اور یہ تنازعہ ختم ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آئی تو صدر انجمن ترقی اردو بہار پروفیسر عبدالمغنی نے اپنے انتقال سے صرف ایک ماہ قبل (اگست ۲۰۰۶ء) انجمن کی مجلس عاملہ کی تشکیلِ نو کی، جس میں چار نائب صدور نامزد کیے گئے۔اس فہرست میں ایک نام پروفیسر قمر اعظم ہاشمی صاحب کا بھی تھا۔انجمن سے ۴۵ر سال کی وابستگی کے دوران یہ پہلا موقع تھا کہ قمر اعظم ہاشمی صاحب کو انجمن کا ایک عہدیدار بنایا گیا۔ورنہ وہ اس سے قبل تک ہمیشہ مجلس عاملہ کے رکن کی

حیثیت سے ہی انجمن میں سرگرم اور متحرک رہے۔ پروفیسر عبدالمغنی ،صدر انجمن ترقی اردو ، بہار کے انتقال (۵/ستمبر ۲۰۰۶ء) کے بعد جب پروفیسر ایم۔ اے۔ صدیقی انجمن کے صدر منتخب کیے گئے تو تین نائب صدور میں ایک پروفیسر قمراعظم ہاشمی بھی شامل تھے، لیکن انجمن میں چل رہے تنازعہ سے بددل ہو کر قمراعظم ہاشمی نے ۲۰۰۷ء میں اپنے عہدے سے استعفا دے دیا۔ اس طرح پورے ۴۵/سال تک وہ انجمن سے وابستہ رہے۔ انجمن سے سبکدوشی کے باوجود ان کے اندر اردو کی خدمت کا جذبہ حسب سابق موجزن رہا جو ان کی زندگی کی آخری سانس تک قائم تھا۔ یہ سچ ہے کہ اس زمانے میں پروفیسر ہاشمی اپنی خرابیِ صحت اور ضعیف العمری کے سبب پہلے کی طرح متحرک اور فعال نہیں رہ سکے، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اردو پر جب بھی کوئی افتاد پڑی تو ہاشمی صاحب کبھی خاموش بھی نہیں رہے۔ کسی محفل میں اگر کسی نے اردو کے خلاف ایک لفظ بھی کہا تو قمراعظم صاحب نے اسے کبھی برداشت نہیں کیا اور اسے منھ توڑ جواب دے کر خاموش کر دیا۔ موصوف کو جاننے والے لوگوں نے کھلی آنکھوں یہ دیکھا ہے کہ اس ضعیف العمر اور ضیق النفس (Bronchal Asthma) کے کہنہ مریض کی ڈوبتی رگوں میں اردو کے لیے آخر دم تک وہی جذبہ موجزن تھا جو نصف صدی قبل ان کی رگوں میں ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

قمراعظم ہاشمی کی اردو سے بے پناہ محبت کا ایک واقعہ جس کا مشاہدہ صرف میں نے نہیں بلکہ سینکڑوں لوگوں نے کیا تھا جس کا ذکر کرنا یہاں ناگزیر سمجھتا ہوں۔ ۲۵/دسمبر ۱۹۹۷ء کو حاجی پور میں اردو ٹیچرس یونین، ویشالی کے زیر اہتمام اردو ٹیچرس کانفرنس ہونی تھی۔ جس میں دیگر دانشوران کے ساتھ پروفیسر قمراعظم ہاشمی بھی مدعو تھے۔ مذکورہ تاریخ کو شدید ٹھنڈک تھی۔ حتیٰ کہ کہاسے کی دبیز چادر میں لپٹے سورج کا بھی دیدار نہیں ہوا تھا۔ ہمیں یہ خطرہ تھا کہ قمراعظم صاحب ضیق النفس کے مریض ہیں، اس ناسازگار موسم میں وہ ٹرین کا سفر کرکے حاجی پور نہیں پہنچ سکیں گے۔ لیکن موصوف ہانپتے کانپتے وقت مقررہ پر حاجی پور تشریف لے آئے۔ ہم لوگوں نے دیکھا کہ ان کا تنفس بڑھا ہوا ہے اور وہ بات کرنے کی بھی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ انھوں نے تنفس کو کنٹرول کرنے والی دو تین دواؤں کے نام لکھ کر راقم السطور کو دیے۔ فوراً دوا منگائی گئی۔ دوا کھا کر جب موصوف نے کچھ راحت محسوس کی تب کانفرنس ہال میں تشریف فرما ہوئے اور تا اختتامِ کانفرنس چار بجے شام تک وہاں موجود رہے۔ انھوں نے خود بھی تقریر کی اور دوسرے لوگوں کی تقاریر بھی بیٹھے سنتے رہے۔ انھوں نے ڈاکٹر عبدالمالک وزیر حکومت بہار کے ساتھ مل کر راقم السطور کے

ترتیب دیے ہوئے مجلّہ کا اجرا بھی کیا۔

پروفیسر قمراعظم ہاشمی کی اردو دوستی کا ایک اور ذکر بہار یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر اور ممتاز ناقد، ماہر جمالیات پروفیسر شکیل الرحمٰن نے اپنی تحریر ''پروفیسر قمراعظم ہاشمی کی اردو دوستی'' میں یوں کیا ہے:

''جب میں بہار یونیورسٹی کا وائس چانسلر تھا تو ڈاکٹر ہاشمی اکثر ملنے آجاتے تھے اور عموماً بعض عمدہ تجویزیں سامنے رکھ دیتے تھے۔ ان سے تبادلۂ خیالات کرتے ہوئے مجھے ہمیشہ خوشی ملی۔ وہ بہار میں اردو کی ہر اہم تحریک سے وابستہ رہے ہیں۔ بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنوانے کی تحریک میں ان کی حیثیت بھی نمایاں رہی ہے۔''۔۔۔

۔۔۔بہار یونیورسٹی کیمپس میں ایک نئی عمارت کی تعمیر ہوئی اور میں نے اس عمارت کے ایک حصّے کو شعبۂ اردو کے لیے وقف کر دیا، میں نے بہار یونیورسٹی آتے ہی شعبۂ اردو کو شعبۂ فارسی سے الگ کر دیا تھا، اس کا ذکر ہر جگہ تھا۔ پوری ریاست کے اردو دوست بہت خوش تھے۔ ڈاکٹر قمراعظم ہاشمی ایک بڑے وفد کے ساتھ میرا شکریہ ادا کرنے آئے تھے۔ (اردو اور فارسی کا شعبہ الگ الگ کرنے کے سلسلے میں پروفیسر ہاشمی کی بڑی کاوشیں تھیں)۔ انھوں نے وہاں جو تقریر کی تھی اس سے سب متاثر ہوئے تھے۔ تقریر کرتے ہوئے وہ اتنے جذباتی ہوگئے کہ رو پڑے۔ آگے بڑھے اور میرے ہاتھوں کو بوسا دینے لگے۔ وہ منظر اب بھی جب یاد آتا ہے تو اردو سے ان کی بے پناہ محبت کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔''

(پروفیسر قمراعظم ہاشمی: ایک ہمہ جہت شخصیت۔ مرتب۔ ولی احمد ولیؔ، ص:۴۳)

❋

قمراعظم ہاشمی کی منتخب کتابیں: ایک مطالعہ

پروفیسر قمراعظم ہاشمی کی ہشت پہلو شخصیت کا ایک نمایاں باب اُن کی کتابیں (تصنیفات/ تالیفات/ ترتیب) ہیں۔ پچھلے اوراق میں ہم یہ مطالعہ کر چکے کہ قمراعظم ہاشمی ایک فعال، مستعد اور ذمہ دار استاذ کی حیثیت سے منفرد مقام رکھتے تھے۔ اردو کی لسانی تحریک میں بھی انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور کارہائے نمایاں انجام دیے۔ بہار کی اردو تحریک اور اردو زبان وادب کی ترقی وبقا کے لیے قمراعظم ہاشمی کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔

پروفیسر قمراعظم ہاشمی کی انفرادیت کے کئی پہلو ہیں۔ کالج اور یونیورسٹی کی ملازمت اپنی جگہ اور قمراعظم ہاشمی کی علمی، ادبی وتحریکی سرگرمیاں اپنی جگہ۔ ان کے قلم کی روشنائی کبھی نہیں سوکھی۔ طبیعت کی خرابی اور گرتی صحت کا بھی ان پر کوئی خاص اثر نہیں دیکھا گیا۔ وہ مسلسل انہماک کے ساتھ علمی وادبی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ پڑھتے رہے پڑھاتے رہے۔ لکھتے رہے چھپتے رہے۔ ان کا ذہن ہمیشہ بیدار، چُست، چاق وچوبند اور توانا رہا۔ ادبی محاذ آرائیوں سے دور قمراعظم ہاشمی اپنی فکر ونظر اور بصیرت کا لوہا دنیائے ادب میں منواتے رہے۔

قمراعظم ہاشمی کی جملہ تصنیفات وتالیفات کی تعداد ۱۸/رہے۔ ان کتابوں کے علاوہ بہت سارے مضامین رسائل میں بکھرے ہیں جنھیں یکجا کیا جائے تو چند کتابیں اور تیار ہوسکتی ہیں۔ کتابوں کی یہ فہرست تعداد کے اعتبار سے مختصر ضرور ہے، لیکن معیار، مواد، موضوعات کے تنوّع کے اعتبار سے گراں قدر ہے۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے قمراعظم ہاشمی کے وسعتِ مطالعہ اور وسیع النظری کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی چند کتابوں کے تعارف حسبِ ذیل ہیں۔

• ''اردو ڈرامہ نگاری''

اردو ڈرامہ نگاری قمراعظم ہاشمی کی ایک اہم تصنیف ہے۔ یہ کتاب پہلی بار 1975ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد بھی اس کے دو اور ایڈیشن منظر عام پر آئے۔ سال 1989ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا جبکہ سال 2000ء میں تیسرا ایڈیشن چھپا۔ علمی وادبی حلقوں میں یہ کتاب مقبول عام ہوئی۔ تقریباً 125/صفحات پر مشتمل یہ کتاب اردو ڈرامہ نگاری کی تاریخ وتنقید کا مکمل ومبسوط احاطہ کرتی ہے۔ اس کتاب میں اردو ڈرامہ نگاری کے فن، اردو ڈرامے کے ارتقا، ڈراما اور اسٹیج کے ربط، اردو تھیٹر کے زوال جیسے موضوعات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ آغا حشر کاشمیری جنھیں اردو ڈراما نگاری کا شیکسپئر بھی تسلیم کیا جاتا ہے، ان کی ڈراما نگاری اور ان کے عہد کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ آغا حشر کاشمیری کے بعد اردو میں ڈراما نگاری کے فن اور پیش کش کے اعتبار سے کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں ان پر بھی قمراعظم ہاشمی نے ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ آغا حشر کے بعد اردو میں ڈراما نگاری کے فن کو قائم رکھنے والوں میں چند اہم نام مثلاً امتیاز علی تاج، محمد مجیب، اختر اورینوی، عابد حسین اور اشتیاق حسین قریشی جیسے فنکاروں کے فن کا مطالعہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

اس کتاب کی سب سے پہلی تحریر اردو ڈرامے کا ارتقا ہے۔ اس مضمون میں قمراعظم ہاشمی نے مختلف ادوار میں اردو ڈراموں کی پیش کش، ان کے موضوعات، اسٹیج پر فنکاری کے ہنر، ناٹک اور ڈرامے کے فرق، ڈرامے کے لیے مخصوص ماحول، اصول وضوابط، اندازِ بیان اور زبان وبیان جیسے موضوعات کو یکجا کر کے اردو ڈرامے کے ارتقا پر روشنی ڈالی ہے۔ قمراعظم ہاشمی کے مطابق محض سیر وتفریح، مذہبی پیغامات اور حصولِ معاش کے مقصد سے شروع ہوا اردو ڈرامے کا فن جب واجد علی شاہ کے دربار کی پناہ میں پہنچا تو وہاں حُسن وعشق اور لب ورخسار کے علاوہ زندگی کا نہ تو کوئی دوسرا مقصد تھا اور نہ نشانہ۔ غرض عشق ومحبت کی داستانوں سے پہلے بادشاہ اور ان کے امراء لطف اندوز ہوئے۔ پھر یہ کاروبار ہر کس وناکس کی تفریح کا سامان ہوا۔ امانت کے ''اندرسبھا'' نے ناچ گانوں، دیو پریوں کے فرضی اور غیر فطری مناظر سے اردو ڈراموں میں ایک دھوم سی مچادی۔ ''اندرسبھا'' سے متاثر ہوکر متعدد ڈرامے لکھے گئے۔ ڈرامائی عناصر سے محروم یہ ڈرامے رقص وموسیقی کی مزید توسیعی شکل کے علاوہ ناظرین کے درمیان کوئی ٹھوس، مثبت اور پائیدار پیغام پہنچانے میں ناکام رہے۔ ''راجہ گوپی چند اور جالندھر'' اردو کا پہلا ڈرامہ ہے جو واقعتاً ڈرامے کے اجزائے ترکیبی کو ملحوظ رکھ کر لکھا گیا۔ ۲۶/نومبر ۱۸۵۳ء کو اسے اسٹیج کیا گیا اور ہر خاص وعام نے اس ڈرامے میں اپنی دلچسپی دکھائی۔

قمراعظم ہاشمی اردو ڈراموں کے دوسرے دور جو کہ ۱۸۸۵ء سے شروع ہوا اس دور کو دوسری زبانوں کے ڈراموں کے اردو تراجم سے تعبیر کرتے ہیں۔اس دور میں متعدد زبانوں کے ڈراموں کا اردو ترجمہ کیا گیا اور انھیں اسٹیج بھی کیا گیا۔اسی عہد میں طالب بنارسی نے نثری مکالموں ، ہندی گیتوں اور اردو گانوں کا استعمال کر کے اردو ڈراموں میں ایک نئی جان پیدا کی۔ڈراما ''ہریش چندر''، ''لیل ونہار''، ''خزانۂ غیب''، ''کرشمۂ قدرت''، ''طلسماتِ گُل'' اور ''گوپی چند'' وغیرہ اس عہد کے ممتاز ڈرامے تسلیم کیے گئے۔

اردو ڈراموں کا تیسرا دور جو ۱۸۹۶ء میں شروع ہوا اس دور کو قمراعظم ہاشمی ڈرامے کے فروغ اور ارتقا کے لیے سنگ میل قرار دیتے ہیں۔آغا حشر کاشمیری کا تعلق اسی عہد سے ہے۔پروفیسر ہاشمی ،آغا حشر کاشمیری کی فنکارانہ اور تخلیقی بصیرت کے قائل ہیں اور یہ تسلیم کرتے ہیں کہ بہت تھوڑی مدت میں انھوں نے اردو ڈراما اور اسٹیج کو کئی ترقی یافتہ افقوں پر پہنچایا،لیکن وہ آغا حشر کے ڈراموں میں پائی جانے والی کمیوں کی جانب بھی واضح اشارہ کرتے ہیں۔

پہلی جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد اردو ڈراموں کا جو چوتھا دور شروع ہوا اس کے بارے میں قمر اعظم ہاشمی لکھتے ہیں کہ اس عہد میں ڈراموں کے زبان میں فروغ ،تاریخی ومعاشرتی مسائل پر توجہ دی گئی،لیکن ڈراموں کے قصے اسٹیج کے مطالبات کو پیش کرنے میں اس انداز میں کامیاب نہ ہو سکے جس کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔نتیجہ یہ ہوا کہ ڈرامہ ادبی تقاضوں کو تو پورا کرتا رہا لیکن ناظرین سے دور ہوتا گیا۔نشرواشاعت کی سہولیات اور فلموں کے آغاز کے اثرات بھی اس پر مرتب ہوئے۔ڈرامے کی تماشائی خصوصیتیں مدھم ہوگئیں اور اسٹیج کا رکھ رکھاؤ ختم ہوتا گیا۔

۱۹۳۰ء سے اردو ڈراموں کا جو پانچواں دور شروع ہوا،اس دور کو قمراعظم ہاشمی ڈرامے کے ذخیرہ میں اضافہ کی حیثیت مانتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ اس دور میں فکر وفن دونوں سطحوں پر ایک بلندی پائی گئی۔نئے گوشے منظر عام پر آئے،زندگی کے مطالبات ومسائل سے ہم آہنگی پائی گئی۔لیکن اسٹیج سے جڑے لوگوں کا جھکاؤ فلموں میں ایکٹنگ کی جانب اس قدر بڑھا کہ ڈراموں کے اسٹیج کی جانب بتدریج زوال آتا گیا۔

اس کتاب کی ایک دوسری تحریر ''آغا حشر کاشمیری کا عہد'' ہے۔مضمون مختصر مگر جامع ہے۔ پروفیسر ہاشمی کا خیال ہے کہ آغا حشر نے فنی اور تخلیقی سطح پر بلاشبہہ اردو ڈراموں کو نئی تازگی اور رعنائی

بخشی۔فرضی دیومالائی قصوں سے چنگل سے اردو ڈرامے کو بہت حد تک آزاد کرایا اور اسے ایک کھلی فضا دستیاب کرائی۔اس طرح اردو ڈراما غیر فطری لب ولہجہ اور اسلوب وبیان سے الگ ہو کر انسانی ماحول سے قریب ہوتا گیا۔

''آغا حشر کاشمیری کے بعد اردو ڈرامے'' اس کتاب کی ایک دوسری اہم تحریر ہے۔اس تحریر میں پروفیسر قمراعظم ہاشمی آغا حشر کے بعد اردو ڈراموں کا تجزیہ کرتے ہوئے مولانا غیاث اللہ دہلوی،عزیز احمد،نورالہدیٰ،محمد عمر نیاز،شاہد احمد دہلوی،زبیر احمد تمنائی،فضل حق قریشی،مجنوں،امیر احمد دہلوی،قدسیہ زیدی اور جلیل احمد قدوائی جیسے اہم ڈرامہ نگاروں کے نام بلا تکلف لیے ہیں۔ان میں بیشتر ڈراما نگاروں نے بڑی تعداد میں انگریزی ڈراموں کے تراجم اردو میں کیے ہیں۔ان ترجموں سے اردو ڈراموں کے موضوعات میں تو تنوع پیدا ہوا مگر بقول پروفیسر قمراعظم ہاشمی ''معیار میں کوئی خاص بلندی نہ آسکی،توقعات تو بڑھیں مگر پوری نہ ہوسکیں۔'' اردو ڈراموں میں امتیاز علی تاج کی گراں قدر خدمات کا جائزہ پیش کرتے ہوئے قمر اعظم ہاشمی کا خیال ہے کہ امتیاز علی تاج کی فنی وتخلیقی صلاحیتیں ''انارکلی'' تک محدود ہو کر رہ گئیں،اور ان کے دوسرے ڈرامے اس معیار کو پانے سے قاصر رہ گئے۔پھر بھی امتیاز علی تاج کے یہاں مکالمے کی زبان توانا،الفاظ وتراکیب چُست،قصہ گوئی میں نفاست اور طرزِ ادا دلکش وشیریں ہے۔قمراعظم ہاشمی نے چند دوسرے اہم ڈراما نگاروں محمد مجیب،اختر اورینوی،عابد حسین اور اشتیاق حسین کی ڈراما نگاری پر بھی مختصراً روشنی ڈالی ہے اور ان کے فن کا جائزہ پیش کیا ہے۔

مجموعی طور پر یہ کتاب اردو ڈراما نگاری کے مرحلہ وار ارتقا کی مکمل اور مربوط داستان پیش کرتی ہے۔معروف ادیب وناقد پروفیسر ارتضیٰ کریم کی یہ رائے مان لی جائے تو کہنا چاہیے کہ پروفیسر قمراعظم ہاشمی نے بحیثیت ناقد اردو ڈراما نگاری کے تعلق سے جو خطِ مستقیم کھینچا،اردو ڈراما نگاری ابھی اسی نہج پر قائم ہے۔ملاحظہ ہوں پروفیسر ارتضیٰ کریم کے الفاظ:

> ''اردو ڈراما نگاری،قمراعظم ہاشمی کی تحقیقی تصنیف ہے جس میں انھوں نے اس صنف کے عہد بہ عہد ارتقا کو پیش کیا ہے۔آغا حشر کاشمیری کا عہد،اردو تھیٹر کے زوال کے اسباب ،ڈراما نگاری کا فن،اسٹیج اور ڈراما،حشر کے بعد اردو ڈراما نگاری، یک بابی اور نثری ڈرامے جیسے عنوانات قائم کر کے انھوں نے اس صنف کا جائزہ ہر پہلو اور ہر زاویے سے لیا ہے۔''

(بہار کا اردو ادب۔ ارتضٰی کریم۔ ص:۱۰۸)

پروفیسر ارتضٰی کریم کے اس تبصرے کے بعد پروفیسر عبدالمغنی کی وہ رائے بھی صد فی صد درست ہے جسے انھوں نے اس کتاب کا ابتدائیہ لکھتے ہوئے تحریر کیا ہے:

''زیرِ نظر کتاب پر ایک نظر ڈالنے سے اردو میں ڈراما نگاری کا ایک مربوط نقشہ مل جاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس صنف کے مستقبل کو روشن کرنے کے لیے اردو ادب کے پاس روایات و تجربات کا ایک ماضی بہرحال ہے۔ اردو ادب کے ہر طالب علم کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے اور اسے ہر کتب خانے کی زینت بننا چاہیے۔''

(اردو ڈراما نگاری۔ قمر اعظم ہاشمی۔ ص: ح)

- ''بہار کے نظم نگار شعرا''

اس کتاب کی اشاعت 1979ء میں ہوئی۔ یہ کتاب پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کی تالیف ہے۔ اس کتاب میں بہار کے نظم نگار شعراء کا عہد بہ عہد جائزہ لیا گیا ہے۔ پروفیسر ارتضٰی کریم اس کتاب کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بہار کے نظم نگار شعراء، بہار میں نظم نگاری کے عہد بہ عہد ارتقا کی تاریخ کو سامنے لاتی ہے۔ اس میں رکن الدین عشق سے لے کر احمد تنویر جیسے نظم نگار شعرا کی مختصر سوانح اور اوران کا پہلا کلام شامل کیا گیا ہے۔ اس طرح اس میں تمام اہم نمائندہ نظم نگار شعراء کی شمولیت ہوگئی ہے۔''

(بہار کا اردو ادب۔ ارتضٰی کریم۔ ص:۱۰۹)

ڈاکٹر ابوبکر رضوی کے بقول ''بہار کے نظم نگار شعراء'' پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کی ایسی تالیف ہے جس میں تحقیقی زاویوں کے ساتھ ساتھ تنقیدی رنگ نمایاں ہے۔ ڈاکٹر ابوبکر رضوی کا یہ تاثر اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس کتاب میں پروفیسر ہاشمی نے عملی اور نظری تنقید کا عمدہ نمونہ پیش کیا ہے۔ اگر کتاب کی پہلی تحریر ''نظم نگاری کی روایت'' کی بات کی جائے تو اس مضمون میں قمر اعظم ہاشمی نے فن اور فنکار کی ذمہ داریوں، فن سے فنکار کی والہانہ وابستگی، تخلیق کے پیچھے فنکار کی جذباتی ہم آہنگی جیسے موضوعات

پر اظہار خیال کیا ہے۔ انھوں نے غزل کے بالمقابل نظم گوئی کے ذیل میں رباعی، قطعہ، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، مسدس، ترجیع بند، ترکیب بند اور آزاد نظم کو جگہ دی ہے۔ انھوں نے شاعری کی ان تمام اصناف کے تعارف پیش کرتے ہوئے ان کے ہیئتی تغیرات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ قمر اعظم ہاشمی کا خیال ہے کہ نثر ہو کہ شاعری صرف ہیئت ہی وہ چیز ہے جو ایک کو دوسرے سے جدا کرتی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''نثر و شعر کی کوئی صنف ہو، کوئی ہیئت ہو، کوئی سانچہ ہو یہ معاملہ سب کے ساتھ ہے۔ اس لیے معیاری شاعری اور معیاری نثر نگاری کے مطالبات میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ ہیئت ہی کا فرق خط مستقیم حائل کرتا ہے۔ یہ صنفی یا نوعی فرق نثر و شعر کے مختلف سانچوں کو ممیز اور نمایاں کرتا ہے۔''

(''بہار کے نظم نگار شعراء'' ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی۔ ص:۳۰)

اس کتاب کی سب سے اہم اور معرکتہ الآرا تحریر ''بہار میں نظم نگاری'' ہے۔ قمر اعظم ہاشمی نے اس مضمون میں صوبۂ بہار میں نظم نگاری کی مکمل تاریخ لکھ ڈالی ہے۔ مشہور نظم گو رکن الدین عشق اور غلام جیلانی کے عہد کو قمر اعظم ہاشمی نے بہار میں نظم نگاری کا ابتدائی دور قرار دیا ہے۔ علاوہ ازیں قمر اعظم ہاشمی نے اس مضمون میں بہار میں اردو شاعری اور اردو زبان و ادب کی ابتدا اور اس کی نشو و نما کی بھی تاریخ بیان کی ہے۔ قمر اعظم ہاشمی کے مطابق بہار روزِ اوّل سے ہی اردو زبان و ادب کی آماجگاہ رہا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ دہلی، دکن، پنجاب اور اتر پردیش کے ساتھ ساتھ بہار کی بھی اردو زبان و ادب کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے۔ یہاں کے ادیبوں اور شاعروں نے بھی اس زبان کے فروغ میں دوسروں کے بالمقابل اپنا تعاون پیش کیا۔ قمر اعظم ہاشمی کے الفاظ میں:

''اب تک کی تحقیقات سے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ امیر خسرو ہی کے عہد میں بہار میں اردو زبان کی نشو و نما شروع ہو چکی تھی۔ اور خواجہ نقشبند سجاد کے بعد بھی یہ روایت برقرار رہی نہیں، ارتقا کے مرحلوں سے کامیابی کے ساتھ گزرتی رہی۔''

(''بہار کے نظم نگار شعراء'' ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی۔ ص:۹)

ڈاکٹر ابوبکر رضوی نے مقالہ کی اہمیت و افادیت کو تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے:

''مشمولہ شعراء کے تذکرے میں ان کا مختصر تعارف انھوں نے بڑے نپے تلے انداز میں پیش کیا ہے۔ تذکرے میں تاریخی حوالے بھی آئے ہیں اور بعض اوقات

تنقیدی نکات بھی۔''

(قمر اعظم ہاشمی کی تنقید نگاری۔ابوبکر رضوی۔ص:۶۳)

- ''نقش ہائے رنگ رنگ''

'نقش ہائے رنگ رنگ' قمر اعظم ہاشمی کی ترتیب ہے۔اس کی اشاعت ۱۹۷۰ء میں پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے غالب صدی تقریبات کے موقع سے کی۔ابوبکر رضوی کے الفاظ میں:

''اس (کتاب) میں ہاشمی کا مقدمہ ''صریر خامہ'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔عنوان سے ہی ظاہر ہے کہ یہ غالبؔ کی غزل کے ایک مصرعے 'غالبؔ صریر خامہ نوائے سروش ہے'، سے ماخوذ ہے۔یہ دراصل غالب صدسالہ تقریبات کے موقع پر منعقد سمینار کی روداد ہے جو غالب کے فکر وفن کے بعض اہم گوشوں کی نشاندہی کرتا ہے۔''

(قمر اعظم ہاشمی کی تنقید نگاری۔ابوبکر رضوی۔ص:۶۳)

- ''مثنوی سحر البیان''

میر حسن کی مشہور ومعروف کتاب 'مثنوی سحر البیان' کو گراں قدر مقدمہ کے ساتھ قمر اعظم ہاشمی نے ۱۹۸۵ء میں ترتیب دیا۔ابوبکر رضوی نے قمر اعظم ہاشمی کی اس ترتیب کا تجزیہ ان الفاظ میں کیا ہے:

''مثنوی سحر البیان کا مقدمہ چار شقوں پر پھیلا ہوا ہے۔پہلی شق میں مثنوی نگاری کے فن کا اجمالی تنقیدی جائزہ ہے۔دوسری شق میں مثنوی نگاری کی روایت اور عہد بہ عہد ارتقاء پر روشنی ڈالی گئی ہے۔تیسری شق میں مثنوی سحر البیان کا ناقدانہ جائزہ پیش کیا گیا ہے۔چوتھی اور آخری شق میں مثنوی کی خامیوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔''

(قمر اعظم ہاشمی کی تنقید نگاری۔ابوبکر رضوی۔ص:۶۴)

- ''واردات''

پریم چند کے افسانوی مجموعہ ''واردات'' کو ایک مفصل اور مربوط مقدمہ کے ساتھ قمر اعظم ہاشمی نے ۱۹۹۱ء میں ترتیب دیا۔قمر اعظم نے اپنے اس مقدمہ میں پریم چند کے فن کا تجزیہ ان کی انسان دوستی،عوامی شناخت،بالعموم انسانی مشکلات وآزمائش کے اظہار و بیان اور اس سے پہنچنے والے سماجی

شعور، سماجی تبدیلیوں اور سماجی تغیرات کی تشریح وتنقید خوبصورت انداز میں کی ہے۔کہنا چاہیے کہ قمر اعظم نے اس مقدمہ کے ذریعہ پریم چند کے مطالعہ کو ایک نئی جہت دینے کی کوشش کی۔

- ''ضحاک۔ایک تنقیدی مطالعہ''

ڈاکٹر محمد حسن کے ڈرامہ ''ضحاک'' کا تنقیدی مطالعہ قمر اعظم کی ایک اہم تالیف ہے، جسے ایوانِ ادب، پٹنہ نے ۱۹۸۴ء میں شائع کیا۔یہ کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے۔پہلے باب میں فن ڈراما نگاری سے بحث کی گئی ہے۔دوسرے باب میں اردو ڈراما نگاری کی ارتقا کا جائزہ پیش کیا گیا ہے اور تیسرے باب میں محمد حسن کی ڈرامہ نگاری کا تجزیہ کیا گیا ہے، بالخصوص ''ضحاک'' کے حوالے سے۔اس تیسرے اور آخری باب کو تین ذیلی سرخیوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔(۱) پلاٹ کی تشکیل (۲) کردار نگاری اور (۳) تناؤ اور تصادم۔

محمد حسن ایک ممتاز ناقد کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔تنقید نگار کے ساتھ ساتھ ایک ڈراما نگار کے طور پر بھی ان کی پہچان مسلم ہے۔اور ''ضحاک'' تو ایک ایسا ڈراما ہے جس نے محمد حسن کو اردو دنیا میں ہمیشہ کے لیے زندہ جاوید بنا دیا ہے۔اس ڈرامے کا فن، ڈرامے کی پیش کش، مکالمہ وغیرہ اجزائے ترکیبی اتنے نپے تلے اور مناسب ہیں کہ یہ محمد حسن کی شاہکار تصنیف قرار پائی ہے۔اس ڈرامے کی خوبی واہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے قمر اعظم ہاشمی لکھتے ہیں:

''ایسے ڈرامے دورِ جدید میں کم ہی لکھے گئے ہیں جن کی فنّی قدر و قیمت نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔''ضحاک'' کا شمار یقیناً انہیں چند ڈراموں میں ہے جس میں ایک ممتاز تنقید نگار نے اپنی بہترین تخلیقی بصیرت کو بکمال احتیاط پیش کیا ہے۔یہ مختصر ڈراما اسٹیجی تقاضوں کی تکمیل بھی کرتا ہے اور حالاتِ عصر کے گہرے شعور کا حامل بھی ہے۔''

(''ضحاک ایک تنقیدی مطالعہ: قمر اعظم ہاشمی: پیشِ تحریر)

- ''عصری ادب کا شعو''ر

پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کے مختلف النوع تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ ''عصری ادب کا شعور'' 1983ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔یہ کتاب قمر اعظم ہاشمی کی معرکتہ الآرا تصنیف ہے۔''عصری ادب کا شعور'' 17/ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔اس کتاب میں شامل مضامین کے عنوانات حسبِ ذیل

ہیں: ''عصری ادب کا شعور، افسانے کی عصری حسیت، نظم اور عصری نظم نگاری، اردو تنقید کی موجودہ روش، علی گڑھ تحریک کا اردو ادب پر اثر، ادب اور رومانیت، فراق کی غزل، جمیل مظہری اور تصور خدا، اجتبیٰ رضوی کی شاعری، پرویز شاہدی کی نظم نگاری، احتشام حسین کا اسلوبِ تنقید، راشد۔ جدید نظم کا ایک معمار، کلام واہی میں واقعہ نگاری، لطف الرحمٰن کی غزلیں، لندن کی ایک رات، لاجونتی اور اکھڑتے خیموں کا درد۔ ان مضامین کے مطالعہ سے قمر اعظم ہاشمی کے تنقیدی تصورات واضح طور پر سامنے آتے ہیں۔ پروفیسر ہاشمی ادب کو سماج کا آئینہ تصور کرتے ہیں۔ ان کی خمیر میں بھی تعمیری ادب اپنی بھرپور توانائی و تازگی کے ساتھ موجود ہے۔ وہ ادب کے روایتی اصولوں کے ساتھ بدلتے منظرنامے کو بھی مخلصانہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ ادب کے تعلق سے ان کے یہاں شدت پسندی نہیں پائی جاتی ہے۔ وہ اعتدال پسندی کے قائل ہیں۔ الفاظ کی بازیگری اور تخیّل کے سہارے پیش قدمی کرنے والے خیالات کو وہ ادب کے لیے مضر قرار دیتے ہیں۔ عمدہ عصری ادب کس طرح منظر عام پر آسکتا ہے اور سماج و معاشرے کو متاثر کرسکتا ہے اس جانب بھی قمر اعظم ہاشمی کے یہاں واضح ہدایات ملتی ہیں۔ اس کتاب کی انھی خصوصیات کی بدولت ابوبکر رضوی نے لکھا ہے کہ:

> ''ان مضامین کے مطالعہ سے قمر اعظم ہاشمی کے تنقیدی نقطۂ نظر کا واضح اور مکمل اظہار ہوتا ہے۔ جہاں تک اس کتاب کا تعلق ہے یہ ان کی دوسری تصانیف کے مقابلے میں زیادہ گراں مایہ اور وقیع ہے۔ اس سے ان کی تنقیدی صلاحیت کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔''

(قمر اعظم ہاشمی کی تنقید نگاری۔ ابوبکر رضوی۔ ص: ۶۶)

''عصری ادب کا شعور'' کا تعارف پیش کرتے ہوئے ممتاز ادیب و ناقد احمد جمال پاشا نے لکھا ہے:

> ''عصری ادب کا شعور'' ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ نوجوان ناقد نے نظم اور تنقید کا تجزیہ اور تشریح کی ہے۔ ادب کے مذاقِ نو اور مزاجِ عصر حاضر سے قاری کو آشنا کرانے کی کوشش کے ساتھ حال پر نظر رکھتے ہوئے کچھ فن کاروں اور فن پاروں کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھا ہے۔ جیسے ''لطف الرحمٰن کی غزلیں'' اور ''اکھڑتے خیموں کا درد''۔ انھوں نے ماضی کے دریچوں سے ماضی قریب اور ماضی بعید کی بھی جھلکیاں پیش کی ہیں۔ علی گڑھ تحریک، رومانیت،

> فراق، جمیل مظہری، اجتبیٰ رضوی، پرویز شاہدی، احتشام حسین، راشد، سجاد ظہیر اور بیدی کا کسی نہ کسی فنی اور فکری پہلو سے احاطہ کیا ہے۔''

(سہ ماہی ''ادراک'' شمارہ ۴ تا ۷۔ ص ۲۰۶)

''عصری ادب کا شعور'' کا ناقدانہ جائزہ پیش کرتے ہوئے ممتاز ناقد ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی لکھتے ہیں:

> ''قمر اعظم ہاشمی ادب کی عصری بصیرت اور عصری قوت کے سنجیدگی سے قائل ہیں۔ اس لیے انھوں نے جہاں ادب کے روایتی اقدار، تہذیبی روایات اور گم شدہ اقدار حیات کی روشنی کو محفوظ و مطمئن مستقبل کے لیے ضروری قرار دیا ہے وہیں اقدارِ نو کی بصیرت، عصری معاملات و مسائل کی اضطراب آمیز جستجو اور جدید فنی و انتقادی رجحانات کے مطالعے کو بھی اہمیت دی ہے جو تخلیقی فکر و بصیرت کو جلا بخشتا ہے۔''

(پروفیسر قمر اعظم ہاشمی: ایک ہمہ جہت شخصیت۔ مرتب۔ ڈاکٹر ولی احمد ولیؔ۔ ص۔ ۱۹۷۔۱۹۸)

- ''مضامین''

پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کے چند تنقیدی مقالات کا انتخاب ''مضامین'' کے نام سے سنہ 1998ء میں منظر عام پر آیا۔ یہ مجموعۂ مضامین 9 تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے۔ ان مضامین کے عنوانات حسبِ ذیل ہیں: کلکتہ کی اسٹیج روایت اور ڈرامے، خالد: ایک صاحبِ طرز تمثیل نگار، مرثیہ بطور رزمیہ، مرثیہ نگاری: کلیم الدین احمد کی نظر میں، ترقی پسند تحریک اور اردو ناول، کلامِ اکبر اور اصلاح معاشرہ، اقبالؔ کی اردو نظموں کا تکنیکی سلیقہ، فراقؔ کی ایک نظم اور ظفر حمیدی اور ان کی شاعری۔ یہ مضامین بھی قمر اعظم ہاشمی کے تنقیدی موقف کی مزید توسیع ہیں، جس میں عملی تنقید اور نظری تنقید کے نمونے دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان مضامین میں فن، فنکاری اور فنکار کے اصول، ضوابط اور ذمہ داریوں کا محاکمہ شامل ہے۔

- ''ادبی تقویمات''

پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کے تنقیدی مضامین کا انتخاب ''ادبی تقویمات'' کے نام سے سال 2008ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب کے مرتب پروفیسر ارشد مسعود ہاشمی ہیں، جو پروفیسر قمر اعظم ہاشمی صاحب کے صاحبزادے ہیں اور فی الوقت جے۔ پی۔ یونیورسٹی، چھپرہ میں پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ یہ کتاب ان 42 تنقیدی مضامین کا انتخاب ہے جو قمر اعظم ہاشمی کی

چالیس سالہ ادبی زندگی کے دوران ملک و بیرون ملک کے مقتدر رسالوں میں شائع ہوئے یا کسی سمینار و سمپوزیم میں پڑھے گئے۔ان ۴۲ مضامین میں وہ مضامین بھی شامل ہیں جو ان کی دو مستقل تنقیدی تصانیف ''عصری ادب کا شعور'' اور مضامین'' میں شامل ہیں۔

''ادبی تقویمات'' میں شامل مضامین کے عنوان کچھ اس طرح ہیں: عصری مسائمت، عصری ادب کا شعور، موضوع کی تلاش میں، معیاری ادبی نثر، فنکار اور اسٹیبلشمنٹ، رومانیت اور ادب، ادب اور شعور، نیا ادب اور ذات کی تلاش، اردو ادب کی رفتار ترقی، نئے دور کا ذہن، اقبال کی اردو نظموں کا تکنیکی سلیقہ، تہذیب حاضر پر اقبال کی تنقید، اجتبیٰ رضوی کی شاعری، جمیل مظہری اور تصور خدا، فیض کی شاعری میں احتجاج کی لے، فیض اور راشد، راشد۔جدید نظم کا معمار، پرویز شاہدی کی نظم نگاری، فراق کی شاعری میں احساس کی توانائی، فراق کی ایک نظم: ہنڈولہ، فراق کی غزلیں، نظم آزاد۔آجکل، کچھ نئی شاعری کے بارے میں، نظم اور عصری نظم نگاری، بہار کی موجودہ شاعری میں روایت اور جدت، ظفر حمیدی کی شاعری، لطف الرحمٰن کی غزلیں، طرزی کے منظوم تنقیدی اور تبصراتی نقوش: ایک اجتہاد، مرثیہ بطور رزمیہ، عبدالعزیز خالد کی منظوم تمثیل نگاری، تنقید کی تخلیقی حیثیت، اردو تنقید نگاری۔۔۔کل اور آج، پروفیسر احتشام حسین کا اسلوب تنقید، متھلا میں اردو تنقید، افسانے کی عصری حسّیت، منٹو کا فن، ہمارا افسانہ نگار: بیدی، ظفر اوگانوی کے افسانے، لکشمن ریکھا کے افسانے، اقبال انصاری کے افسانے، ڈاکٹر محمد حسن: بحیثیت ڈراما نگار اور اکبر راجع یا مصلح۔

الغرض یہ کتاب قمر اعظم ہاشمی کے ادبی رجحانات اور تنقیدی تصورات کی مکمل داستان ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے قمر اعظم ہاشمی کی اردو ادب بالخصوص تنقید کے میدان میں ان کی خدمات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

- ''اختر شناسی''

اس کتاب کے مرتب بھی ڈاکٹر ارشد مسعود ہاشمی ہیں۔یہ کتاب دراصل ''ساغرِ نو کے اختر اور ینوی نمبر'' کا ہی جدید ایڈیشن ہے جسے ایک مکمل اور جامع مقدمہ کے ساتھ ارشد مسعود ہاشمی نے ضروری ردوبدل اور ترمیم و اضافہ کے ساتھ ترتیب دیا ہے۔ساغرِ نو کا اختر اور ینوی نمبر قمر اعظم ہاشمی کا ایک ایسا ادبی کارنامہ ہے جس کی پذیرائی آج تک ہورہی ہے۔یہ نمبر ۱۹۶۵ء میں منظر عام پر آیا۔اس کی

اشاعت مکتبِ ادب پٹنہ سے ہوئی تھی۔اختر اور ینوی اپنے عہد کے ایک بلند پایہ فنکار تھے، جن کی شخصیت، کارنامے اور فن پر ہندو پاک کی ممتاز ادبی شخصیات نے مضامین لکھے۔قمر اعظم ہاشمی نے ناموافق حالات، گروہ بندیوں اور رخنہ اندازیوں کے بیچ انتھک محنت، لگن اور کاوش کے بل بوتے ''ساغرِ نو'' کا ''اختر اور ینوی'' نمبر نکالا۔یہ ایسا دستاویزی نمبر تھا جو کئی اعتبار سے تاریخی حیثیت کا حامل ثابت ہوا اور آج بھی اس کی کوئی دوسری مثال نہیں دیکھی جارہی ہے۔''اختر شناسی'' کی اشاعت سال ۲۰۰۸ء میں ہوئی جسے کتابستان پرنٹرس، مظفر پور نے شائع کیا ہے۔

- ''سرسری اس جہان سے گزرے''

قمر اعظم ہاشمی کی خودنوشت ''سرسری اس جہان سے گذرے'' سال ۲۰۰۸ء میں منظر عام پر آئی۔یہ خودنوشت ۱۱۶ رصفحات پر مشتمل ہے۔پروفیسر ہاشمی نے نہایت ہی خلوص، سچائی اور ایمانداری کے ساتھ اپنے حالات زندگی کو قلمبند کیا ہے۔اس کتاب کے مطالعہ سے پروفیسر ہاشمی کے حالات زندگی، خاندانی پس منظر، تعلیم و تربیت، علم و عمل، سیرت و کردار کے علاوہ، بہیترے مشاہیر کی کہی ان کہی، سنی ان سنی باتیں، پٹنہ اور مضافات کی ادبی و تحریکی سرگرمیوں کا علم ہوتا ہے۔زندگی کے چھوٹے بڑے واقعات اس خوبصورتی کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں کہ حقیقت بھی آشکار ہوتی ہے اور ادبیت بھی برقرار رہتی ہے۔بالکل معروضی انداز میں لکھی گئی اس خودنوشت میں نہ گلہ ہے نہ شکوہ ہے، نہ اپنی بڑائی ہے، نہ کسی پر تہمت ہے۔بلکہ ہر جگہ ایک زندہ دل اور بیدار مغز انسان کی سچائیاں اور حکایتیں ہیں۔خودنوشت دلچسپ ہے۔پوری کتاب پڑھ جایئے کہیں بھی اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا۔اس خودنوشت کی اشاعت کے بعد متعدد ادبا نے اس پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔یہاں چند ادیبوں و دانشوروں کی آراء نقل کی جارہی ہیں جس سے اس خودنوشت کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے۔

> ''یہ ایک ایسی خودنوشت (Autobiography) ہے جہاں اپنی شخصیت کی خودنمائی سے گریز کرتے ہوئے دوسروں کے کارناموں، ان کی قربت، ان کے اثرات وغیرہ کا ذکر زیادہ شدت سے ہے۔دوست احباب ہوں یا بزرگ ہستیاں ان کے ذکرِ خیر میں پروفیسر ہاشمی نے نہایت کشادہ ذہنی کا ثبوت دیا ہے۔دراصل

یہ انسانی نفسیات ہے کہ ایک اچھے انسان کو دوسروں کی کمزوریوں سے زیادہ اس کی خوبیاں نظر آتی ہیں۔شاید یہ اندازِ فکر خود اس شخصیت کی عظمت کی پہچان ہے۔''

ڈاکٹر قمر جہاں

(سہ ماہی ''اصنافِ ادب'' قمر اعظم ہاشمی نمبر۔ص:۱۱۵)

''پروفیسر ہاشمی کی اس خودنوشت میں ان کے عہد کے چھوٹے بڑے لوگوں کی، جن میں سیاست داں، مصلحت اندیش، محبّ وطن، محبّ زبان، احباب، استاد اور شاگرد اور کچھ عام لوگ شامل ہیں۔لیکن ہر جگہ مصنف کی ذات حاوی نظر آتی ہے جس سے کہیں کہیں متضاد صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔لیکن آپ بیتی میں جو ایک فن لطیف ہے، جس سچائی اور ہمت وجرأت کے ساتھ ساتھ سچ کو سچ کہنے اور جھوٹ کو غلط بتانے کی ضرورت کا التزام کیا جاتا ہے وہ اس خودنوشت میں بھی موجود ہے۔''

ڈاکٹر حسن عباس

(سہ ماہی ''اصنافِ ادب'' قمر اعظم ہاشمی نمبر۔ص:۱۲۰)

''قمر صاحب کی یہ خود نوشت تمام ادبی محاسن سے ممیّز ہے۔الفاظ کی نشست وبرخاست، جملوں کی موزونیت، کیفیت کے مطابق فقروں کا بھرپور استعمال، بوریت سے پاک، بوجھل پن سے مستثنیٰ، دلکشی سے لبریز، دلچسپی سے پُر، فنی تقاضوں سے مزیّن، علمی نکات سے منصور ہے جو ذہن ودل پر نقش ہوتی نظر آتی ہے۔''

مظفر حسین مظفر

(آئینہ پس آئینہ۔مرتب۔ارشد مسعود ہاشمی۔ص:۱۵۳)

- **''عرب امارات کا سفری دورانیہ'':**

معروف ادیب، ناقد وشاعر پروفیسر منظر اعجاز کے الفاظ میں ''عنوان کے لحاظ سے تو اس کتاب کی نوعیت سفرنامے جیسی ہے لیکن مشتملات کے اعتبار سے یہ روزنامچہ ہے اور خود پروفیسر ہاشمی نے اسے روزنامچہ قرار دیا ہے۔انتقال سے صرف دو سال قبل پروفیسر ہاشمی اپنے چھوٹے بیٹے اطہر شاہین ہاشمی کے پاس متحدہ عرب امارات گئے تھے۔پروفیسر موصوف نے روزنامچہ کے طور پر سفر کے دوران تمام واقعات کو قلمبند کیے۔اور پھر انھیں ترتیب وار پکی روشنائی میں منتقل کیا۔اس سفرنامہ میں ان کی گھریلو زندگی،

افرادِ خانہ، رشتہ داروں، قرابت داروں کے تذکرے ہیں۔متحدہ عرب امارات کی تہذیب وثقافت کا بھی جگہ جگہ ذکر ہے۔متحدہ عرب امارات کے سیر وتفریح کے مقامات، ساحلی حصّوں کی منظرکشی، مختلف مساجد کی خوبصورتیاں، بازاروں اور ہوٹلوں کے تذکرے بھی بیان کیے گئے ہیں۔اس کتاب کو بھی اہل علم حضرات نے پسند کیا اور اس کی پذیرائی کی۔یہاں چند اقتباسات نقل کیے جا رہے ہیں:

''ہاشمی صاحب کا یہ روزنامچہ ۱۸؍ستمبر ۲۰۰۹ء بروز جمعۃ الوداع سے شروع ہوا ہے اور ۲۲؍نومبر ۲۰۰۹ء کی روداد پر ختم ہو گیا ہے۔گویا یہ روزنامچہ دو مہینہ چار دن کی سیر وتفریح سے متعلق مقامات اور قابلِ ذکر مظاہرہ وموجودات کے مشاہدے اور تجربے پر مشتمل ہے۔واقعات وواردات کی نقش آرائیوں اور جلوہ سامانیوں میں ہاشمی صاحب کے منظرنگار قلم اور نیرنگِ نظر نے مشترکہ طور پر وہ کارہائے نمایاں انجام دیے ہے جس سے ایک جہانِ حیرت منصۂ شہود پر جلوہ افروز نظر آتا ہے۔دورانِ مطالعہ قلم کی ان حیرت فروشیوں کے مشاہدے سے آنکھیں کیفیت استعجاب سے پھیلتی سکڑتی رہتی ہیں۔''

ڈاکٹر منظر اعجاز

(سہ ماہی ''اصنافِ ادب'' قمر اعظم ہاشمی نمبر۔ص:۱۲۸)

''پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کا تحریر کردہ یہ سفرنامہ جو اس وقت میرے سامنے ہے، سیر وسیاحت کی روداد محض یا فاضل مصنف کی افتادِ طبع کا غماز نہیں بلکہ متحدہ عرب امارات کے جغرافیائی، تاریخی، علمی، تہذیبی، ثقافتی اور معاشرتی حالات کا ایک ایسا انسائیکلوپیڈیا ہے جس میں اس اسلامی ملک کی اجتماعی زندگی کے مختلف نشیب وفراز کی بہت ہی واضح، مؤثر اور حقیقی تصویر پیش کی گئی ہے۔''

مسعود شمس

(''آئینہ پس آئینہ'' مرتب۔ارشد مسعود ہاشمی۔ص:۲۷)

''اس سفرنامہ میں بہت سے نئے نئے ادیبوں اور شاعروں کا بھی ذکر ہے۔ان سب ادیبوں اور شاعروں سے مصنف کی ملاقات تو نہیں ہوئی لیکن ''خلیج ٹائمز''، ''الشرق''، ہفتہ وار ''جرأت'' وغیرہ اخبارات کے مطالعے سے جن ادبی

شخصیات سے واقف یا متاثر ہوئے ان کا ذکر اس سفرنامہ میں کیا۔ پاکستانی شاعرہ فاخرہ بتول، مسیحی نعت گو شاعر نذیر قیصر، متحدہ امارات کے شاعر ڈاکٹر زبیر فاروق جو اردو میں شاعری کرتے ہیں اور جن کی مادری زبان عربی ہے، نئی نسل کے شاعر مسعود تنہا وغیرہ کا بھی ذکر ہے اور ان کے منتخب اشعار بھی نقل ہوئے ہیں۔غرض یہ سفرنامہ قمر اعظم ہاشمی کی ایک یادگار تحریر ہے جو ان پر کام کرنے والوں کو ضرور پڑھنا چاہیے۔''

ڈاکٹر مشتاق احمد مشتاق

(''آئینہ پس آئینہ'' مرتب۔ارشد مسعود ہاشمی۔ص:۹۱۔۹۲)

یہ چند اہم کتابیں ہیں قمر اعظم ہاشمی کی، جن کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔قمر اعظم ہاشمی کی تحریروں میں جو چیزیں صاف طور پر نمایاں ہیں وہ ہیں ان کی فکر انگیزی، مطالعہ کی وسعت، گہرائی، عرق ریزی، اختصار اور جامعیت۔قمر اعظم ہاشمی سمندر کو کوزے میں بند کرنے کا ہنر بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ان کی تحریروں کو پڑھتے ہوئے اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا۔ ہر جگہ ایک فرط وانبساط کی کیفیت محسوس کی جاتی ہے۔ادق اصطلاحیں، مشکل تراکیب اور فرسودہ خیالات سے وہ اپنی تحریروں کو زخمی نہیں کرتے ہیں۔ ذہن کی کشادگی، فکر کی بلندی، احساس کی توانائی اور تجزیہ کی اعتدال پسندی قمر اعظم کی تحریروں کی انفرادیت ہیں۔ وہ بہت سوچ سمجھ کر قلم اٹھاتے ہیں۔قلم ان کے نزدیک پاک دامنی کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ وہ قلم کا سودا نہیں کرتے۔قلم کی حُرمت کا انھیں ہر جگہ پاس ولحاظ ہے۔وہ قلم کے سہارے علم کے پیامبر بن کر ابھرتے ہیں۔

قمر اعظم ہاشمی کی منتخب تحریریں

ادب اور شعور

قیمتی اور نادر تجربات، لطیف ترین احساسات، عمیق ترین جذبات اور بلند ترین تخیل و افکار کے ذریعۂ اظہار کو ادب کہتے ہیں۔ ادب زندگی کا جزو لطیف ہے۔ جس میں جمال کی حسن آرائیوں کے ساتھ جلال کی عظمتیں بھی پوشیدہ ہیں۔ اور شعلے کی طرح اس میں چمک دمک کے ساتھ تپش و حرارت بھی ہے۔ ادب التباس حواس کا نام نہیں، بلکہ یہ شعور کی پوری قوت سے وقت کے تقاضے کو پورا کرتا ہے۔ زندگی کی بے راہ رویوں، خامکاریوں اور کجرویوں کو اجاگر کرتا ہے۔ ادب میں اس لحاظ سے سرتاسر ارضیت ہوتی ہے لیکن اس خارجیت کے ساتھ داخلیت کے اہم عناصر بھی کارفرما ہوتے ہیں اور ان سب کا انحصار شعور پر ہے۔ ادیب کا شعور جتنا بالغ ہوگا ادب اتنا ہی ارفع و اعلیٰ ہوگا۔ نفسیاتی اعتبار سے ذہن یا دماغ کے تین طبقات معین کیے گئے ہیں۔ طبقہ اول تو تشکیل پذیر کا شعور ہے جو بہت جلد تھک جاتا ہے۔ یہ شعور بیداری اور تدبیر علم ہے۔ یہ ارتقا پسند ہوتا ہے جس کے ذریعہ ہم اپنے تمام کام کی اہمیتیں اور مختلف تدابیر سوچا کرتے ہیں۔ یہی شعور ایجاد و اختراع اور علمی بحث و تنقید میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے ذریعہ ہم تنقید اور مجادلہ و مناظرہ کرتے ہیں۔ شعور ہی ہے جو ہمارے مذہبی اور سیاسی عقائد کی حد بندی کرتا ہے اور انسانوں کے مزاجوں اور ان کے اخلاق و کردار کی تشکیل کرتا ہے اور ان کے ارتقا یا انحطاط پر اثر انداز ہوتا ہے۔ شعور کی ان اہمیتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بے خوف کہا جاسکتا ہے کہ اس کا مطالعہ گویا تمام انسانی شخصیتوں اور سماج و قوم کا مطالعہ ہے اور ادب بغیر ان مطالعوں کے بس تفریح طبع ہی کا ذریعہ ہوگا، جس پر افلاطونی حکم صادر کرنا بالکل حق بجانب ہوگا۔ شعور ثقافت جدید کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اس پر عصر نو کی مکمل اور گہری چھاپ ہوتی ہے۔ یہ احساس و ادراک اور برہان و تجربہ کی عقل ہے۔ ادیب اسی قوت شعور کے ذریعہ جذبات اور احساسات کو سیدھے سادے انداز میں بیان نہ کرکے ان کو بلند و برتر کرتا ہے۔ خود بھی بلند و برتر ہوتا ہے اور ہمیں بھی اپنی سطح ارفع تک لے جاتا ہے۔ جس کے لیے مکمل آزادی کی ضرورت ہوتی

ہے۔ یہی نہیں بلکہ ادب کو بھی اتنا واضح ہونا چاہیے کہ ادیب جس موضوع کو چاہے اسے اس شکل میں پیش کرسکے۔ کیونکہ اس کا اہم کام عواطف و احساسات کو بلند و برتر شکل میں پیش کرنا قارئین کو بام ارتقا تک لے جانا اور ان کے میلانات و خواہشات کو اپنی ظاہری سطح سے ترقی یافتہ صورت میں استعمال کرنا ہی ہے۔ غرض کہ ذہن کا طبقہ اول (شعور) اپنے گرد و جود دیکھتا ہے اس سے متاثر ہوتا ہے، اور زبان حال سے اس کا اظہار کرتا ہے۔

ذہن کا طبقہ دوم ماقبل شعور ہے۔ اس کی ادبی طور پر زیادہ اہمیت نہیں۔ پھر بھی یہ خیالات گذشتہ کا چھوٹے پیمانہ پر ایک بڑا خازن ہوتا ہے۔ اور وقتاً فوقتاً حسب ضرورت خیالات سپلائی کرتا رہتا ہے۔ یعنی چند گھنٹے قبل یا ایک دو ایام گذشتہ کے اہم واقعات اور معمولات یہ محفوظ رکھتا ہے۔

اس سے گزر کر ذہن کا طبقہ سوم لاشعور ہے۔ یہ لاشعور کا بڑا اہم طبقہ ہے۔ اس کی کارگزاریوں اور اثر اندازیوں کا ہمیں علم نہیں ہوتا۔ اس کا عمل خیالات کی بہ نسبت خوابوں میں زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ کیونکہ اس وقت شعور کی بندھنیں ڈھیلی پڑ جاتی ہیں۔ ادب اپنے اکثر و بیشتر اسالیب میں لاشعور پر اعتماد کامل رکھتا ہے۔ ادب اور اس کے تمام شعبہ جات مثلاً اشعار، قصص، تصاویر اور مجسموں میں ہم دراصل وہی لذت پاتے ہیں جو خوابوں اور خیالوں میں پنہاں ہے۔ ادیب فنون جمیلہ میں سے کسی ایک کے ذریعہ جو اس کے لیے مختص ہو ان پوشیدہ جذبات سے رہائی حاصل کرنا چاہتا ہے، جن کو تہذیب و تمدن دبا دیتے ہیں۔ اور یہ کام بالکل شعوری طور پر مشکل ہے۔

اس کے لیے ادیب کو ایک خاص موڈ یا کیفیت کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ موڈ یا کیفیت بس شعور کی بندھنوں اور بندشوں کو کمزور و نحیف کرنے کا کام ہے۔ ادیب کی شراب نوشی اور افیون خوری یا اسی طرح کی دوسری عادتیں ادیب کی شعوری بندشوں کو بہت کمزور کردیتی ہیں اور بعض اوقات تو یہ بندشیں ٹوٹ جاتی ہیں اور ادیب کے تحت الشعور سے فوق النقد گراں (Super Critical Censor) کی گرفت اٹھ جاتی ہے، جس سے اس کے لاشعور کی تخلیقی قوت حرکت میں آکر محسوسات کی نئی دنیا کو جنم دیتی ہے اور تب فن کا اظہار ہوتا ہے۔ کالرج کی ''کبلا خاں'' جیسی طویل نظم بس افیوں خوری ہی کے نتیجہ میں معرض وجود ہوئی۔ پھر شراب نوشی کے باعث جو ادب پارے وجود میں آئے ان کی مثالیں تو خود اردو اور فارسی میں بھری پڑی ہیں۔ اس نظریے کی ایک دوسری شکل یہ ہے کہ ادیب تخلیقی عمل کی خاطر کچھ رسوم کی ادائیگی ضروری سمجھتا

ہے۔مثلاً شکر لکھتے وقت اپنے میز کے نیچے سڑا ہوا سیب رکھ لیا کرتا تھا یا بالزاک پادری کا لباس پہن کر لکھا کرتا تھا۔بہرکیف،فرائیڈ نے ادب کی تشریح کرتے ہوئے بتایا ہے کہ خواب،بیداری کے خواب اور ادب میں کوئی فرق نہیں ہے۔یہ آدمی کی تشنہ خواہشوں کی تکمیل کا بدلہ ہوا روپ ہے اور یہی ادب میں حسن کاری کا سرچشمہ ہے۔چونکہ ادیب ہی کی طرح عام آدمی کی تمنائیں آرزوئیں بھی تڑپ تڑپ کر اس کے دل میں دم توڑ دیتی ہیں اس لیے پڑھنے والے کے لیے بھی ادب اسی درجہ پر باعث تسکین ہے جس درجہ پر خود ادیب کے لیے کیونکہ عام آدمیوں کی تشنہ کامیوں کا ازالہ ادب کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔اس عمل کو نفسیاتی اصطلاح میں کتھارسیس (Cathrsis) کہتے ہیں۔

بہرنوع لاشعور ہی اصل سرچشمہ ہے،جس کی چمن بندی شعور کرتا ہے۔شعور ہی کی حد بندیوں اور کرم فرمائیوں کی بدولت فن میں مطالبات اور ماحول کے تقاضے ملتے ہیں۔لاشعور کے تمام خام خیالات کو شعور اپنے طور پر سمجھ بوجھ کر منظّم و مرتب کرتا ہے۔اور تب اس کو فن کا روپ ملتا ہے۔شعور بذات خود بہت سے حالات داخلی یا خارجی سے متاثر ہوتا رہتا ہے۔ہم اپنی سہولت کے لیے شعر و ادب کی روشنی میں لاشعور اور شعور کا ایک مختصر سا جائزہ لیتے ہیں۔

ادب میں لاشعور کی بڑی اہمیت ہے۔ماہرین نفسیات متفق الرائے ہیں کہ لاشعور کا ادب پر بڑا گہرا اثر پڑتا ہے۔بلکہ ادب کا ذریعۂ تخلیق ہی یہ ہے۔فرائیڈ نے ادب کو خالص aedipus complex کی پیداوار بتایا ہے۔جس کی بنیاد بچپن ہی میں پڑا کرتی ہے۔فرائیڈ کو اس کا بھی یقین ہے کہ شخصیت کی ترقی جنسی جذبہ ہی کی وجہ سے ہوتی ہے۔اس کی ایک مثال اناطول فرانس کی ایک تحریر سے دی جا سکتی ہے جس میں اس نے نپولین کو نامرد لکھتے ہوئے بتایا ہے کہ چونکہ نپولین کو اپنی اس جنسی خامی کا شدت سے احساس تھا اس لیے اس نے شادی جنگ ہی سے کر رکھی تھی۔

بہرکیف،فرائیڈ کے نزدیک ادب تمام تر داخلیت کا مظہر ہے۔ایک مخصوص قوت جنسی جسے نفسیاتی اصطلاح میں libido energy کہتے ہیں،ناکامیوں اور تشنہ کامیوں کی وجہ سے شعر و ادب کا راستہ اختیار کر لیتی ہے۔اور اپنی تمام خواہشوں تمناؤں اور جذبوں کا ذریعۂ اظہار شعر و ادب کو بناتی ہے۔یونگ بھی فرائیڈ کی راہ پر چلتا ہے لیکن سراسر جنسیت کے عمل کا وہ قائل نہیں ہے۔وہ ایک ایسے بلند و برتر جذبہ ارتقا کا بہ اعتبار اس کی اصلی قوت کے اعتقاد رکھتا ہے جو خوابوں اور خیالوں کو ابھارنے کا موجب

ہوا کرتا ہے۔اس کا نظریہ ہے کہ اس قسم کے میلان کا اثر قدیم مذہبی افسانوں اور دیرینہ ثقافت و تہذیب میں جھلکتا ہے۔بہرکیف یونگ بھی ادب کے لیے داخلی شعور پر زور دیتا ہے۔ایڈلر ایک تیسرا ماہر نفسیات ہے۔یہ نہ فرائیڈ کا نظریہ قبول کرتا ہے نہ یونگ کا۔اس نے اپنا ایک الگ انفرادی مدرسہ قائم کیا ہے۔اس کے یہاں سارے حرکات و اعمال کا مرکز قوت و اقتدار کو تسلیم کیا گیا ہے۔اور اس میں بھرپور داخلیت ہوتی ہے۔ایک چوتھا ماہر نفسیات مظفر شریف (ترک) مصر ہے کہ تمام اعمال انسانی سماجی اثرات کے تحت واقع ہوتے ہیں یعنی ماحول کے تقاضات کا اثر انسانی حرکات و افعال پر پڑتا ہے۔ماحول کی یہ اثر اندازی بھی لاشعوری و طور پر ہوتی ہے۔ان چاروں کے علاوہ یونانی،عربی اور ہندوستانی ماہرین بھی آرٹ کو وجدانی یا لاشعوری تسلیم کرتے ہیں۔

ان تمام نظریات سے قطع نظر ادب کو ہم قطعی داخلیت کا عکاس نہیں بنا سکتے۔اس میں خارجی عناصر کی شمولیت ضروری ہے۔بے شک مصدر فن لاشعور ہے لیکن تکمیل فن دماغ کے منطقی حصہ سے وابستہ ہے۔یہ ضرور ہے کہ شعوری کیفیات و تجربات سے گزرنا ضروری ہے۔ادب کو ادب برقرار رکھنے کے لیے ادیب کو جرمن ناول نگار ''ایملی زولا'' کی طرح ریاضتیں اور محنتیں کرنی پڑتی ہیں۔

فن کی تکمیل میں شعور کا بڑا ہاتھ ہے۔یہ خارجی ہوتا ہے۔ادیب کے لیے اپنے ماحول کا جائزہ لینا اور اس کے مزاج کو صحیح طور پر سمجھنا بڑا اہم کام ہے۔زمانے کے مطالبات،گرد و پیش کے تقاضات اور وقت کی ضروریات پر نظر رکھنا ہی ادیب کا کمال ہے۔اور اسی کمال پر ادب کا شاندار یا غیر شاندار مستقبل مرکوز ہے کیونکہ قصر مستقبل کا انحصار خشت و خال ماضی پر ہوا کرتا ہے۔زندگی میں ہر سمت متضاد قوتیں کارفرما ہیں۔سکون و انجماد میں زندگی نہیں۔زندگی سیلابی دریا کی تند و تیز موجوں کے بھیانک ٹکراؤ کا نام ہے۔جھیل کی خامشی و سکوت زندگی نہیں،زندگی میں طوفان ہے،مدوجزر ہے،نشیب و فراز ہے اور کمال و زوال ہے۔

اگر ادب زندگی کی عکاسی کرتا ہے اور اگر فن حیات کا ترجمان ہے تو ہستی کے تمام اتار چڑھاؤ اور زیر و بم سے ادیب کو بھی گزرنا پڑے گا۔اگر اس نے زندگی کے تقاضوں سے نظریں چرالیں تو اس نے بے ایمانی کی،اخلاقی و ادبی بے ایمانی۔زندگی سے فرار ایک سچے ادیب کا کام نہیں اور نہ جھوٹی تصویریں دیکھنا یا دکھانا ہی اس کا فرض ہے۔ادیب کا کام بڑا مشکل اور مقدس و متبرک ہے۔اسے ہر کوئی انجام نہیں

دے سکتا۔ ادب اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ جس زمانے میں ادب کی تخلیق ہوتی ہے اس زمانے کا گرم گرم خون جسم ادب میں دوڑتا نظر نہ آجائے اور اس زمانے کا دل پیکر ادب میں نہ دھڑک اٹھے۔ اس کے لیے ادیب کو قربانیاں پیش کرنی پڑتی ہیں۔ بعض وقت ایسا بھی آتا ہے کہ ادیب اس مقدمہ عظیم کی خاطر بے دست و پا ہوتا ہے۔ پھر بھی سماجی شعور کے پیش نظر تمام زحمتیں برداشت کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ ادب کو وقت کے دھاروں پر موڑنا اور ان کو بہ انداز تحسین پیش کرنا ادیب کا کمال ہے اور اس کے لیے اسے صرف اپنے داخلی شعور کے اعتماد کو ترک کر کے سماجی شعور کا بھی بہ نظر غائر مطالعہ کرنا پڑے گا۔ آج کا ادب بھی اگر الف لیلوی عناصر سے بھرا پیش کیا جانے لگے تو اسے کون لبیک کہے گا؟ ادیب اگر وقت کا نباض ہوتا ہے اور بیشک ہوتا ہے تو اس کا فرض ہے کہ زمانے کے تقاضات و تضادات کو اپنے مخصوص جمیل و لطیف انداز بیان میں پیش کرے۔ میکسم گور کے الفاظ میں ادب تنقید حیات ہے اور یہ اس لیے تنقید حیات نہیں کہ زلف جاناں کی مشاطگی میں دن رات منہمک رہے۔ ادب عرش نشیں نہیں فرش نشیں ہے اور یہ زندگی کی تمام بے راہ رویوں اور خامیوں کو اجاگر کرتا ہے اور اچھی اور نیک راہ کی رہنمائی کرتا ہے۔

صرف تذکرۂ عشق و شباب پر ادب اگر منحصر ہے تو گویا راجہ اندر کا اکھاڑہ ہے۔ سچا ادیب غیر شعوری طور پر زمانے کے تقاضات کو پیش کرتا ہے۔ آج کے ادب میں عصر حاضر کی تمام جھلکیاں موجود ہیں۔ کل کی پستی کا شعور آج بام عروج پر جلوہ فگن ہے۔ شعور ارتقا پسند ہے اور ادب بھی۔ اگر صرف شعور ارتقا پسند ہوتا تو آج کا ادب اس مقام تک نہ پہنا ہوتا۔ آج بھی اس میں الف لیلویت اور چوما چاٹی بھری ہوتیں۔ ادب کسی دیوانے کا منتشر اور مہمل خواب نہیں، بلکہ شعور کی پوری قوت کے ساتھ وقت اور ماحول کی ساری دھڑکنوں کو ٹٹولتا ہے۔ زمانے کے ہر بیرونی اور اندرونی سانس کے کاربن اور آکسیجن کو پرکھتا ہے اور اس کو بہ انداز جمال پیش کرتا اور فن کے حسن کو برتتا ہے۔

(''ادبی تقویمات'' مرتبہ۔ ڈاکٹر ارشد مسعود ہاشمی)

شعر و ادب میں طنز و ظرافت کے عناصر

سب سے پہلے اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ طنز و ظرافت ادب کی کسی منظوم یا منثور صنف کا نام نہیں ہے۔ یہ دراصل انسانی مزاج کی دو کیفیتیں ہیں جن کا مظاہرہ نثر و نظم کی کم و بیش تمام صنفوں میں ہوتا رہا ہے۔ چونکہ یہ دونوں عناصر بشری مزاج کے دو مختلف انداز کی ترجمانی کرتے ہیں اس لیے فطری طور پر ان کے تقاضے جداگانہ ہیں۔ ظرافت ہی کی ایک سطح مزاح سے عبارت ہے۔ مزاح نگاری کی تہوں میں خوش طبعی، خوش مزاجی اور خوش دلی ہوتی ہے۔ طنز نگاری کی تہوں میں اصلاح پسندی ہوتی ہے۔ طنز میں تلخی ہوتی ہے، مزاح میں مٹھاس، طنز میں جذبے کی تیزی و تندی ہوتی ہے، مزاح میں شگفتگی شادابی، طنز میں فکر کا عنصر ہوتا ہے، مزاح میں بے فکری۔ طنزیہ میلان نقطۂ نظر کے تصادم اور تہذیبی و معاشرتی اصولوں کی کشمکش میں فروغ پاتا ہے۔ مزاحیہ میلان کو ایسی صورت حال کی حاجت نہیں ہے۔ بلکہ بقول نریندر لوتھر ''اطمینان و آسودگی کی فضا اسے زیادہ راس آتی ہے''۔ انسان مطمئن اور آسودہ ہو تو اسے ہری ہری سوجھتی ہے اور تفریح کی طرف مائل ہوتا ہے۔ بے اطمینانیوں نے محاصرہ کر رکھا ہو تو اپنے جذباتی ردعمل کی نوعیت کے مطابق معاشرتی معاملات و مسائل کو نشانۂ طنز بنا کر تسکین کی راہ ڈھونڈتا ہے۔ طنز نگاری ایک ذاتی ردعمل ہے۔ طنز نگار کسی مصلحت کی پرواہ کیے بغیر تحسین ناشناس اور سکوت سُخن شناس کی فکر سے بے نیاز ہو کر اپنے احساس و خیال کو قلمبند کر دیتا ہے۔ مزاح نگار یہ ملحوظ رکھتا ہے کہ دوسروں کو ہنسنے اور ہنسانے کے مواقع فراہم ہو سکیں۔ یعنی مزاح نگار اپنے مخاطب کا خیال رکھے بغیر مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ طنز نگار اپنے مخاطب کو خوش کرنا نہیں چاہتا بلکہ ان کمزوریوں سے آگاہ کرنا چاہتا ہے جن کو شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ نظرانداز کرتا ہوتا ہے۔ مزاحیہ اسلوب میں شوخی و شیرینی ہوتی ہے اور اکہراپن۔ طنزیہ اسلوب میں تجزیاتی برہمی ہوتی ہے۔ معنوی تہہ داری اور مخاطب سے پُرخلوص ہمدردی۔

طنزیہ شعروادب کے پس منظر میں اصلاح کا جذبہ سرگرم عمل ہوتا ہے۔طنز نگار ادیب یا شاعر معاشرے کی کمزوریوں اور گمراہیوں کو دیکھ کر کُڑھتا ہے۔تصورات واعمال کے تضادات اسے اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں تو وہ معاشرتی زندگی کے بے ڈھنگے پن کا مذاق اُڑاتا ہے۔یہ طنزیہ انداز بیان اناڑی اور غیر تربیت یافتہ ہاتھوں میں چلا جائے تو ذوق سلیم کے لیے بارِگراں بن جاتا ہے۔طنز نگار ادیب یا شاعر کا احساس برتری اپنے مظاہروں کے لیے سطحی طریقہ استعمال کرنے لگتا ہے اور کمزوریوں کی اصلاح کا نشہ خود اسے پستیوں کی طرف لے جاتا ہے۔

طنزیہ شعروادب میں حکیمانہ بصیرت، ہمدردانہ سنجیدگی اور خلوص فکر موجود ہو تو اسلوب میں روشن نفاست اور اثرانگیز لطافت پائی جاتی ہے۔اعلیٰ درجہ کی طنزیہ شاعری یا نثر نگاری میں صرف تنقید کی سختی نہیں ہوتی محبت کی نرم روآنچ بھی ہوتی ہے۔بیزاری اور برہمی نہیں ہوتی، غم وغصّہ نہیں ہوتا، انسانیت دوستی کی خوبصورت لہریں اس کی تہوں میں موجزن ہوتی ہیں۔طنز نگار شاعر یا ادیب نفرتوں کی تاریکی نہیں پھیلاتا بلکہ تاریکیوں میں دبی ہوئی زندگی کی صالح قدروں کی روشنی کو اوپر کی سطح پر لانا چاہتا ہے۔

مزاحیہ ادب زندہ دلی، خوش مذاقی اور تفریحِ طبع کا سبب بنتا ہے۔مزاح پیدا کرنا ہی اس کا مقصد ہے۔ظاہر ہے کہ دوسروں کو ہنسانا ایک مشکل کام ہے۔مزاح نگار اس کی کوشش کرتا ہے کہ تہذیب وشائستگی کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹے اور لبوں پر مسکراہٹیں بھی بکھر جائیں، شخصی طور پر کوئی کارٹون بھی نہ بنے اور دلچسپی وخوش طبعی کا پہلو نکل آئے۔مزاح نگار معاشرے کی مختلف سطحوں پر بکھرے ہوئے ہزاروں تجربات میں سے ایسی جہتوں کی دریافت کرتا ہے جو دوسروں کے لیے نایافت ہوں کہ لطف وتفریح کا ذریعہ بن سکیں۔یہاں اخلاقیات کے کسی نکتے کی پیش کش غیر ضروری ہے، پس منظر میں کوئی اصلاحی مقصد بھی نہیں ہوتا۔اسلوب میں غیر سنجیدگی اور شگفتگی کے عناصر کا نمایاں رہنا ضروری ہے۔لیکن نہ اس حد تک کہ ابتذال کی کیفیت پیدا ہو جائے۔

میں بھی ڈاکٹر محسن صاحب کے خیال سے اتفاق کرتے ہوئے طنز ومزاح کی ملی جلی شکل کو ظرافت تسلیم کرتا ہوں۔ظریفانہ نثر ونظم، مزاحیہ نثر ونظم سے اس لیے بلند ہے کہ یہاں تخلیقی انہاک چاہیے۔اپنے تجربے سے پرخلوص وابستگی یہاں ضروری ہے۔ظریفانہ شعروادب کے خیال وبیان میں شوخی وشگفتگی بھی ہوتی ہے اور طنز وطعن میں بھی کبھی مزاح کا عنصر سطح زیریں میں ہوتا ہے اور کبھی طنز کا عنصر سطح

زیریں میں بھی۔مزاحیہ انداز میں طنز کرنا یا طنزیہ انداز میں مزاح پیدا کرنا ہی اس کا مقصد ہے۔کہیں انداز بیان میں مسکراہٹوں کی لطافت ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔۔تجربہ کی تہہ میں طنز کی گرم موج۔کہیں پیرایۂ بیان میں طنز کا تیکھا پن ہوتا ہے اور خیال میں مزاح کی چاشنی۔اس کا انحصار تخلیقی مزاج کے ردعمل کی نوعیت پر ہے۔بہر حال ظریفانہ شعروادب کی تخلیقی کاوشوں کے دوران ادیب یا شاعر کو صبر وضبط اور احتیاط کے مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے کیونکہ انفرادی یا اجتماعی کمزوریوں کو نشانۂ طنز بنانے کے سلسلے میں تنقیدی بصیرت سرگرم عمل ہوتی ہے۔جسے بے لگام چھوڑ دیا جائے تو مزاح کا عنصر ہی پھیل جاتا ہے۔اور ادیب یا شاعر خود اخلاقی اور معاشرتی مسئلوں کے دھندلکوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔طنز کا حربہ ہے تو بہت مفید مگر بے احتیاطی سے استعمال ہو تو اس کا وار اُلٹا بھی پڑ سکتا ہے۔چونکہ مزاح آمیز طنز اور طنز آمیز مزاح دونوں میں مقصدیت موجود ہوتی ہے اس لیے ہلکی سی بے توجہی مقصدیت پسندی کو دفتر نصیحت بنا سکتی ہے اور دربارِ خطابت میں بھی پہنچا سکتی ہے۔ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں نثری یا شعری حسن ماند پڑ جائے گا اور فنکاری رخصت ہو جائے گی۔مصلح ہونا، ناصح، خطیب اور واعظ ہونا اور بات ہے تجربہ ومشاہدہ کو مزاح وطنز کے ساتھ فنکارانہ رنگ میں پیش کرنا اور بات۔دنیائے ادب میں جس طرح خطیب ومصلح کے منظوم یا منثور ارشادات کا کوئی منصب نہیں۔اسی طرح ہنسنے ہنسانے اور طنز کرنے کی اہمیت بھی نہیں ہے۔دیکھنا یہ ہے کہ فنکارانہ حسن بیاں ہے یا نہیں، ادیبانہ طرزِ کلام ہے کہ نہیں، شعری محاسن ہیں کہ نہیں۔مزاح نگاری اور طنز نگاری میں کمال دکھلانا ایک الگ بات ہے اور ان عناصر کو ادب وشعر میں اس طرح استعمال کرنا کہ فنی خوبیاں نکھر کر سامنے آجائیں ایک مستقل فن۔تخلیقی کمال کے جائزے اور تعین کے وقت فنی لطافتوں اور شعری خوبیوں پر نظر رکھنی ہوگی۔ادب وشعر میں الفاظ کی بازیگرانہ بندگی ممنوع ہے۔اس میں طنز کا عنصر ہو یا ظرافت کا، حکمت وبصیرت ہو یا متانت وسنجیدگی، تخلیقی ریاضتوں سے پیدا ہونے والی پرخلوص کشش ہونی ہی چاہیے۔ظرافت کا میدان وسعت مطالعہ، زیادہ ہشیاری، زیادہ شعوری جاگ اور زیادہ فنکارانہ چابکدستی کا طالب ہے۔

خیال کی سطح ہو یا بیان کا مرحلہ یہاں شاعرانہ شعور بے حد چوکنا ہو کر آگے بڑھتا نظر آتا ہے۔کیونکہ ہر لمحہ یہ اندیشہ دامن گیر ہوتا ہے کہ کہیں خیال سرد پھُلجھڑی کی طرح پھُسپھُسا کر نہ رہ جائے اور الفاظ پھکڑ پن کی کھائی میں نہ گر جائیں۔

آپ کی سمع خراشیوں کے لیے معذرت طلب کرتے ہوئے میں ایک بار پھر یہ عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ شعروادب میں طنز ومزاح اورظرافت کے عناصر کی جستجو اورمطالعہ اسی انداز میں ہوتو بہتر ہے۔جس انداز میں انسانی نفسیات اوراحساسات کے دوسرے رنگ کا مطالعہ کیا جاتا رہا ہے۔رجائیت وقنوطیت اورنشاط وحسرت ہی کی طرح ظرافت بھی احساس کی ایک خاص لو،جذبے کا ایک خاص رنگ اوراظہار شخصیت کا ایک خاص انداز ہے جس میں دردناک شادمانی اورمسرت انگیز تشنگی ہوتی ہے۔جس طرح کسی ادیب یا شاعر کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ شروع سے آخر تک قنوطی یا رجائی میلان رکھتا ہواسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی شاعر یا ادیب شروع سے آخر تک ظرافت نگار ہو۔

(ماہنامہ ''شگوفہ'' حیدرآباد۔فروری ۱۹۷۷ء)

سیّد شاہ مشتاق احمد۔ایک شخصی تاثر

بہار میں انجمن ترقی اردو کی لسانی تحریک کوفروغ دینے میں جن سربراہان اردو کے نام امتیازی اہمیت کے حامل ہیں،ان میں سید شاہ مشتاق احمد مرحوم کا نام بھی ہے۔انھوں نے بے حد اخلاص اورلگن کے ساتھ زبان اردو کے حقوق کے حصول کی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

یہ ہے کم وبیش پینتالیس (۴۵) برس قبل کی بات۔میں حصول تعلیم کے لیے ۱۹۶۱ء میں پٹنہ پہنچا۔پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کا ایک طالب علم بن گیا۔داخلہ کے بعد اردو زبان وادب کی سرگرمیوں میں میری دلچسپی بڑھی اوراس شوق کو استاذ گرامی پروفیسراختراورینوی مرحوم نے بڑی تقویت پہنچائی۔۱۹۶۳ء میں پہلی مرتبہ استاذ مرحوم کی اقامت گاہ (واقع چھجو باغ) پرمرحوم سید شاہ مشتاق احمد صاحب کو دیکھنے اور کچھ گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ان کے ساتھ مرحوم غلام سروراورمرحوم بیتاب صدیقی بھی تھے۔استاذ مرحوم کے یہاں سے یہ حضرات باہرآئے تو مولانا مرحوم نے مجھے انجمن کی سرگرمیوں میں شامل ہونے کی دعوت دی اور میں نے بخوشی قبول کرلی۔یہ ابتدا تھی انجمن ترقی اردو کی تحریک میں باضابطہ شریک ہونے کی۔اس وقت اپنی لسانی سرگرمیوں کی وجہ سے انجمن حکومت کی نگاہوں میں مشکوک رہا کرتی تھی،اورانجمن والوں کو''پاکستانی ایجنٹ''اور''فرقہ پرست''وغیرہ کہا جاتا تھا۔مذکورہ بزرگوں کی زبان اردو سے ہمدردی،اس کے حقوق کی جدوجہد کے لیےان کی مستعدی اورسرگرمیوں نے فطری طور پر مجھے بھی متاثر کیااوراب انجمن کی نشستوں میں پابندی سے شرکت کرنے لگا۔

انجمن کی متعدد نشستیں،سید شاہ مشتاق احمد مرحوم کے دولت کدے (واقع بھنور پوکھر) میں بھی ہوتی رہیں اور کچھ نشستیں روزنامہ''سنگم''(بانی مدیر،الحاج غلام سرور) کے دفتر میں بھی۔مجھ سے مرحوم شاہ صاحب سے متعدد ملاقاتیں پروفیسر اسلم آزاد صاحب (موجودہ صدر شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی) کی سابق

اقامت گاہ پر ہوئیں۔ دراز قد، اکہرا جسم، رنگ صاف، آنکھوں پر عینک، سفید کھادی کا لمبا کرتا پاجامہ، پیروں میں چپل اور منھ میں پان۔ یہ تھی ان کی شناخت۔ ان کی رفاقت اور معیت میں، میں نے محسوس کیا کہ شاہ صاحب کے اندر اردو کی بقا اور ترقی کا نہایت پرخلوص جذبہ موجزن ہے۔ جب بھی ان سے ملاقات ہوتی وہ انجمن ترقی اردو ہی کی بات کرتے، اسی کے مسائل پر اظہار خیال کرتے اور مادری زبان کے تحفظ ہی کی تدبیروں پر گفتگو کرتے رہتے۔ کسی طرح کا تصنع یا تکلف ان کے کردار میں نہ تھا۔ ہم جیسے چند نوجوانوں کے ساتھ وہ گلی گلی، کوچے کوچے میں سفر کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ ان ارباب ثلاثہ یعنی سید شاہ مشتاق احمد، غلام سرور اور بیتاب صدیقی کے ساتھ ساتھ پروفیسر عبدالمغنی بھی پیش پیش رہا کرتے تھے۔ اور ہم سب کی سرپرستی و رہنمائی استاد محترم مرحوم پروفیسر اختر اورینوی کیا کرتے تھے۔ ضرورت محسوس ہوتی تو وہ چندہ بھی دیا کرتے اور دوسروں سے چندے فراہم بھی کیا کرتے تھے۔ بالعموم تقریر کا محاذ غلام سرور مرحوم سنبھالتے اور تجاویز اور میمورینڈاز کی ڈرافٹ پروفیسر عبدالمغنی صاحب کے سپرد ہوا کرتی۔ میں ۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۹ء کے دوران ایک طرف ہفت روزہ ''قومی تنظیم'' کو ترتیب دیا کرتا تھا تو دوسری طرف روزنامہ ''سنگم'' کی مجلس ادارت میں بھی تھا۔ شاہ صاحب مرحوم زبان اردو سے متعلق مطالبات اور بیانات و مسائل کو منظر عام پر لانے کے لیے مجھے ہمیشہ تلقین کیا کرتے تھے۔ سچ یہ ہے کہ خود میرے اندر اردو زبان وادب کی خدمت کرنے کا جو شوق پیدا ہوا، وہ انہیں اکابرین کے طفیل میں ہوا۔

میں ۱۹۷۰ء میں مظفرپور چلا آیا۔ اس کے بعد بھی انجمن کی تحریک سے منسلک رہا بلکہ انہیں بزرگوں نے تاکید کی کہ مظفرپور میں زبان اردو کے حقوق کے حصول کے لیے عوامی مظاہروں کا پروگرام بنایا جائے۔ ہمارے مخلص اور سرگرم معاونین میں ایک مرحوم ڈاکٹر عبدالقیوم لعل گنجوی تھے اور دوسرے ڈاکٹر ظاہر حسین شمشاد (موجودہ ریڈر و صدر شعبۂ اردو، ایل این ٹی کالج، مظفرپور)۔ عوامی مظاہرے کا منصوبہ بڑی ہمت اور صبر وضبط کا کام تھا۔ مذکورہ بزرگوں نے اس منصوبے کی تائید کی اور تمام حضرات پٹنہ سے تشریف لائے اور اس اولین مظاہرے میں بہ نفس نفیس شریک ہوئے۔ شاہ صاحب مرحوم، بیتاب صاحب مرحوم، غلام سرور صاحب اور پروفیسر عبدالمغنی صاحب (موجودہ صدر انجمن ترقی اردو، بہار) بھی ہم نوجوانوں کے ساتھ سڑکوں پر دوڑتے رہے اور ''اردو زبان۔ زندہ باد''، ''اردو ہندی بہنیں ہیں، بہنوں

میں سنگھرش نہیں''، ''اردو کو اس کا جائز حق دو'' وغیرہ نعرے بلند ہوتے رہے اور اسی انداز کے پچاسوں بینرس بھی تھے۔ مقامی ٹاؤن ہال، کمپنی باغ سے یہ جلوس اردو برآمد ہوا، سریا گنج، تلک میدان روڈ، دھرم شالہ چوک سے ہوئے کلکٹریٹ پہنچا۔ یہاں کلکٹر کے دفتر کے سامنے تقریریں ہوئیں اور کلکٹر صاحب کو ایک جامع میمورنڈم دیا گیا۔ کچھ ایسے لوگ جن کی مادری زبان، اردو تھی، وہ سہمے ہوئے تھے۔ انہیں خوف تھا کہ ہندو مسلم فساد ہوجائے گا۔ لیکن ہمارے جلوس میں بیشتر کالج طلباء پورے جوش وجذبے میں تھے۔ مجھے ہراساں کرنے کی کاوش بھی کی گئی مگر ان بزرگوں کی تربیت نے مجھے ٹھوس بنا دیا تھا۔ جلوس برآمد ہوا اور اس کے گہرے اثرات قائم ہوئے۔ اللہ کا شکر واحسان ہے کہ اس منظم جلوس اردو اور سربراہان اردو کی تقریروں میں ایسی کوئی بات نہ تھی جس کی گرفت کی جاسکتی ہو یا جس سے کسی فتنے کو پنپنے کا موقع ملتا ہو۔ اسی کے بعد ۱۹۷۴ء کی ''اردو کانفرنس'' کا پروگرام بنایا گیا۔ اس کے لیے بھی مذکورہ سربراہانِ اردو، ایک ہفتہ پہلے ہی مظفرپور تشریف لے آئے اور ہم لوگوں کے ساتھ مختلف محلوں اور گرد ونواح کے قصبات میں وفود کی شکل میں جاتے آتے رہے اور مجوزہ کانفرنس کو کامیاب بنانے کی اپیل کرتے رہتے اور اردو عوام کے ساتھ روا رکھی جانے والی ناانصافیوں کی وضاحتیں کرتے رہے۔ کبھی کبھی شاہ صاحب کا خلوص بے پایاں جوش میں آتا تو کہتے ''ہماری رگوں میں اردو کا خون رواں ہے، ہم لوگ چین سے اس وقت تک نہیں بیٹھیں گے جب تک زبان اردو کو اس کے آئینی حقوق نہ مل جائیں۔ روزنامہ ''سنگم'' سے انہیں اسی لیے زیادہ دلچسپی تھی کہ یہ اخبار اردو کے معاملات ومسائل کو پوری جرأت وجسارت کے ساتھ ارباب اقتدار کے روبرو رکھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پہلی مرتبہ غلام سرور مرحوم جیل گئے تو شاہ صاحب مرحوم خفیہ طور پر ہمارا حوصلہ بڑھاتے تھے۔ ان کی فکر یہ تھی کہ اخبار کی اشاعت بند نہ ہو۔ اس سنگین مرحلے میں استاذ مرحوم اختر اورینوی صاحب کی یاد بھی تازہ ہوجاتی ہے۔ ان دونوں ہی بزرگوں نے ''سنگم'' کی اشاعت کو برقرار رکھنے کے لیے میرا ہر ممکن تعاون کیا۔ اخبار کی مالی حالت اچھی نہ تھی۔ پیسوں کی کمی ہوتی تو یہی بزرگ اس کی اشاعت کے خرچ کی فراہمی کا بندوبست کرتے تھے۔ آخر کار سرور صاحب رہا ہوگئے اور اخبار شائع ہوتا رہا۔

شاہ صاحب انجمن ترقی اردو کے صدر تھے۔ لیکن وہ صدر انجمن سے زیادہ شاہ صاحب ہی تھے۔ ان کی شخصیت بے ریا تھی۔ ان کے سامنے کسی طرح کی مصلحت یا سیاست نہیں ہوتی تھی، اپنا کوئی مفاد نہیں ہوتا تھا۔ تحریک اردو کے وہ ایک ایسے درخشاں ستارہ تھے جس کی روشنی صاف وشفاف تھی۔ اپنا

نقصان کر کے 'اردو کاز' کو تقویت پہنچانے کا جو عزم وحوصلہ ان کے اندر تھا، وہ آج بھی قابل تقلید ہے۔ اللہ پاک ان کی مغفرت فرمائے۔

(سہ ماہی ''ندائے پاسدار'' پٹنہ۔ ''شاہ مشتاق احمد نمبر''۔ جنوری تا مارچ ۲۰۰۷ء)

سمندر پار

اب سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ 'سمندر پار' کا سفر میں نے کس طرح مکمل کر لیا۔ دو مہینے چار دن متحدہ عرب امارات میں پوری سرگرمی کے ساتھ گذار لینا، میرے لیے مشکل تھا۔ میں مسلسل خرابیٔ صحت میں مبتلا تھا اور اس طویل سفر اور قیام کا متحمل ہونا، بہ ظاہر ممکن نہ تھا۔ بچوں کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ گرم اور خشک آب وہوا کا خوشگوار اثر ہوگا، اس لیے وہاں کا سفر اختیار کرنا بہتر اور مفید ہے۔ بعض ڈاکٹروں نے بھی عارضی طور پر جگہ کی تبدیلی کا مشورہ دے رکھا تھا۔ ان سب کے مسلسل اصرار اور حوصلہ افزائی نے میرے اندر بھی خود اعتمادی کو یکجا کر کے آمادۂ سفر ہونے کی ہمت پیدا کی۔

اس روزنامچے میں وہ تاثراتی نقوش ہیں جو متحدہ عرب امارات میں قیام کے دوران کے مشاہدوں اور تجربوں سے حاصل ہوئے۔ میں نے افسانہ طرازی سے قطعاً گریز کرتے ہوئے واقعیت شعاری کی راہ اختیار کی ہے اور ان سچائیوں تک رسائی کی کاوش کی ہے جو وہاں کے معاشرے میں موجود ہیں۔ جن کو میں نے دیکھا، سمجھا، پرکھا اور محسوس کیا ہے۔ اپنے ملکوں کی بیروزگاری سے تنگ آ کر وہاں ''روزی روٹی'' کے حصول کے لیے تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ طبقوں کے لاکھوں افراد جاتے ہیں۔ صبح سے شام تک اس ملک کی تعمیر وترقی کے لیے زبردست محنت اور جانفشانی کرتے ہیں، اور پھر ان کی محنتوں کا واجب معاوضہ بھی نہیں ملتا۔ کسی طرح کی کوئی بیماری لاحق ہوئی تو کوئی طبی سہولت بھی میسر نہیں۔ سرکاری ملازمتیں بالخصوص وہاں کے شہریوں میں رہتی ہیں۔ مختلف ملکوں کی کمپنیاں بیرونی لوگوں کو ملازمتیں دیتی اور ان کا استحصال کرتی ہیں۔ ملکی قوانین بھی ان کے لیے سازگار نہیں ہیں اور انسانی حقوق کی ایسی کوئی موثر تنظیم بھی نہیں جو ان کے معاملات ومسائل کی نگرانی اور تحفظ کرے اور ان کے لیے معاون ہو سکے۔

دبئی تک پہنچنے میں مجھے زیادہ الجھن اور پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ کیونکہ محبی ڈاکٹر ایس ایم

رضوان اللہ بھی ہمسفر تھے۔انہیں بیرونی ملکوں کا خاصا تجربہ تھا اور وہ دومرتبہ حج بیت اللہ کا شرف حاصل کر چکے تھے۔واپسی میں بھی سہولت سفر حاصل رہی۔اس لیے کہ عزیزم مظفر حسیب،مظفر پور تک ہمارے ساتھ رہے اورانہیں بھی بیرونی ملکوں کے بار بار سفر کے تجربے حاصل ہیں۔

پیش لفظ

(''عرب امارات کا سفری دورانیہ'')

آخری تحریر

عمر کے چھیاسٹھویں سال میں مجھے اس کی امید نہ تھی کہ اٹھ بیٹھنے کے لائق ہوسکوں گا اور قلم فرسائی کی مہلت مل سکے گی۔صحت کچھ سنبھلی تو ہمارے چند قدیم اسکالروں اور طالب علموں نے مجھے زندگی کے تجربوں کو تحریر کرنے کی طرف راغب کیا۔کئی ہفتوں تک سوچتا رہا،اپنی قوت تحریر کو یکجا کرتا رہا۔میں نے کیا پایا؟ کیا کھویا؟ یہ سوال بار بار میرا منہ چڑاتا رہا۔میں نے اپنے ضمیر کو مطمئن دیکھا۔چھپانے اور بچانے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ممکن ہے غلطیاں ہوئی ہوں،محسوس کرتے ہی ان کی اصلاح کر لی۔کسی کے خلاف کوئی گروپ سازی نہیں کی۔میں نے ڈھنڈورچی نہیں پالے۔تشہیر پسندی اور جاہ پسندی سے کوسوں دور رہا۔خاموشی اور مستعدی کے ساتھ اپنے منصوبہ عمل پر کار بند رہا۔میں نے محسوس کیا کہ بہت کچھ پایا۔تیز رو وقت کی لہروں پر طمانچے کھاتا رہا اور کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ علمی،لسانی اور تدریسی و ادبی خدمات انجام دینے کا حوصلہ مندانہ شوق پروان چڑھتا رہا،جس میں ریا کاری کا شائبہ بھی نہ تھا۔

میں کیریئرسٹ نہیں تھا۔اگر چہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا لیکن فکر معاش کی زد میں کبھی نہیں آیا۔پرائیوٹ تعلیم کبھی حاصل نہیں کی۔علم وادب سے وابستہ بزرگوں اور دانشوروں کی صحبتوں میں شریک رہا،سبق لیتا رہا اوراپنی تنگیوں میں بھی وسعتوں کو جستجو کرتا رہا۔۱۹۶۵ء میں کچھ دنو ں کے لیے اے۔این۔کالج میں جز وقتی لکچرر ہوا تھا تو عالم گنج سے بورنگ کالج تک سائیکل ہی سے سفر کرتا تھا۔واپس ''سنگم'' کے دفتر دریاپور آتا تھا اور پھر سائیکل ہی سے ۹/بجے شب میں عالم گنج کے لیے روانہ ہوجاتا تھا۔یہ جانفشانی زرگری کے لیے نہیں تھی۔کالج سے ڈیڑھ سو روپے ملتے تھے۔سنگم کے پاس کچھ تھا ہی نہیں،ملتا کیا؟ کبھی کبھار چائے نوشی کے لیے پچاس روپے مل جاتے تھے اور بس۔یہ دراصل اردو کے طالب علموں اور اردو عوام کی خدمت کا جذبہ تھا۔

احوال زندگی رقم کرنے کی محدود صلاحیت ملی ہے تو میں افسانہ طرازی کرنا نہیں چاہتا کیونکہ اس مہلت حیات کو میں ایک نعمت تصور کررہا ہوں۔سوانحی تحریر کے واقعات کی سچائیوں کو واضح کرنے کے لیے سنین کا سہارا لیا گیا ہے،حتی الوسع تاریخیں بھی درج کر دی ہیں تا کہ واقعات کی صحت مند فضا پوری طرح شفاف رہے،محض خودنمائی نہ ہو۔مجھے اس کا احساس ہے کہ میں سب کچھ نہیں جانتا،بہت کچھ نہیں جانتا۔سچ تو یہ ہے کہ جو کچھ جانتا ہوں وہ بہت کم ہے۔میں نے علم رسانی کے اس محدود شعور کو پرخلوص جذبے کے ساتھ نئی نسل تک پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔یہی خلاصۂ حیات ہے۔

پیش لفظ

(''سرسری اس جہان سے گزرے'')

❋

قمر اعظم ہاشمی ادیبوں اور ناقدوں کی نظر میں

پروفیسر شکیل الرحمٰن :

''مجھے یاد نہیں قمر اعظم ہاشمی سے پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی۔کوئی دن تو ہوگا، وہ بے نام دن میرے لیے اس واسطے اہم ہے کہ مجھے قمر اعظم ہاشمی ملے تھے۔دنیا میں قمر اعظم ہاشمی اتنے کم ہیں کہ جب وہ ملے تو میں نے فوراً انھیں دل وجان سے قبول کرلیا، مالِ غنیمت سمجھا یا اللہ کی رحمت نہیں جانتا! یہ سچ ہے کہ انھوں نے مجھے مایوس نہیں کیا اور یہ میرے لیے بہت بڑی بات ہے! ہر وقت وہی رکھ رکھاؤ، گفتگو کا وہی پیارا انداز، لہجے کی وہی نرمی، شریف قدروں کے تئیں وہی بیداری، بزرگوں کے قدرداں، شاگردوں کے مہرباں، ایسے استاد کہ جن پر کسی دیوتا کا گماں ہو، جیسے آیا ہو آکاش سے اتر کر صرف علم کی دولت لٹانے!''

(زبان وادب، پٹنہ ''گوشہ قمر اعظم ہاشمی''۔ص:۳۱)

پروفیسر عبدالمغنی :

''مظفر پور میں ڈاکٹر اختر قادری پورے شمالی بہار کے لیے اردو زبان وادب کی گراں قدر خدمات انجام دے رہے تھے۔لیکن ان کے بعد شمالی بہار میں نہ صرف اردو خوانوں کی تعلیم وتربیت بلکہ اردو کی لسانی تحریک کی تنظیم وترقی کی ذمہ داری بھی قمر اعظم صاحب کے سر پر آگئی اور واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے اسے بخوبی انجام دیا۔اس کے علاوہ تصنیف وتالیف کی مہمات بھی وہ سر کرتے رہے۔اردو تحریک جب بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں اپنی منزل کی طرف بڑھی تو قمر اعظم

صاحب اوران کے رفیقوں نے اس کی صدارت کی ذمہ داری جمہوری طور پر میرے دوش ناتواں پر ڈال دی۔اس وقت سے آج تک جب تین دہائیاں گذر چکی ہیں قمراعظم صاحب مع اپنے رفقاء کے ہر مرحلے کی مشکلات وفتوحات میں میرے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔ڈاکٹر قمراعظم ہاشمی اردوزبان وادب اورتحریک وتنظیم کے لیےایک گراں قدر سرمایہ ہیں۔''

(پروفیسر قمراعظم ہاشمی:ایک ہمہ جہت شخصیت۔مرتبہ:ڈاکٹر ولی احمد ولیؔ۔ص:۴۴۔۴۵)

پروفیسر نجم الہدیٰ :

''قمراعظم ہاشمی ایک جانِ بے تاب کے پیکرِ اظہارکا نام ہے۔ہمیشہ کچھ کہتے رہنااوراظہارِ ذات کے نت نئے پہلو کی تلاش ان کا مرغوب مشغلہ ہے۔کوئی اگر پوچھے کہ سعیٔ مسلسل کا نتیجہ کیا ہوتا ہے تو معاصر شخصیتوں کے تناظر میں اس کا جواب صرف قمراعظم ہاشمی ہوگا۔ادبی دنیا میں شہرت کے تعلق سے چار طرح کے لوگ نظر آتے ہیں۔ایک تو وہ ہوتے ہیں جو اہلیت رکھتے ہیں اورتصنیف وتالیف کے میدان میں کچھ کارِ نمایاں کرکے مشہور ہوتے ہیں اور قدرے شہرت پاتے ہیں یا نہیں پاتے، کچھ ایسے بھی ہیں جو اہلیت کے بغیر شہرت کے بھوکے ہیں اور حالات کی سازگاری سے کبھی شہرت بھی انھیں مل جاتی ہے اور کچھ ایسے ہیں جو لگن، خلوص اورانتھک محنت سے اپنی استعداد پر چلا کرتے ہیں اور بالآخر انھیں اپنی کوششوں کا انعام مل ہی جاتا ہے۔قمراعظم ہاشمی کا تعلق اسی زمرے سے ہے۔''

(پروفیسر قمراعظم ہاشمی:ایک ہمہ جہت شخصیت۔مرتبہ:ڈاکٹر ولی احمد ولیؔ۔ص:۵۳)

پروفیسر لطف الرحمٰن :

''درس وتدریس سے ان کی والہانہ شیفتگی اور تشنگانِ علم وادب کی تشفی اورتسلی اور حوصلہ افزائی کے اعتبار سے ان کے گھر کو کعبۂ امید کی حیثیت حاصل ہے۔ان کی ادبی شخصیت ایک مفکر کی بصیرت اورایک شاعر کی داخلیت کا خوبصورت امتزاج

ہے۔وہ حق العباد اوراحترام بشر کی شاندارروایتوں کے امین ہیں۔انھوں نے دانشورانہ وقار اورفلسفیانہ سنجیدگی کے ساتھ نہ صرف درس وتدریس کے فرائض کما حقہٗ ادا کیے بلکہ تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا میں داخلی اور خارجی سطحوں پر زندگی اور معاشرے کے توازن کو برقرار رکھنے کی ہر تحریک میں مثبت، فعال اور سرگرم حصہ لیا۔اس جہت سے ہم تمام دوستوں میں وہ قدآور شخصیت کے مالک ہیں۔''

(سہ ماہی ''اصنافِ ادب'' مظفرپور۔''قمراعظم ہاشمی نمبر''۔ص:۲۶)

پروفیسر ثوبان فاروقی :

''ڈاکٹر قمراعظم ہاشمی کی رحلت ایک ایسا ادبی سانحہ ہے جس کی تلافی کا امکان دور دور تک نظر نہیں آتا۔وہ تاعمر اردو کاز کے لیے سرگرم عمل رہے۔اردو ہمیشہ ان کے لیے محبوبۂ دلنواز رہی اوران کی ذہنی وروحانی تسکین کا ذریعہ بھی۔اس کے وجود اوراس کی بقا کے لیے ان کی مجاہدانہ سرگردانی مثالی تھی اورآنے والی نسلوں کے لیے مینارۂ ہدایت اور مشعلِ راہ بھی۔ادب سے گہرا شغف اوراردو کی لسانی تحریک سے غیر معمولی جذباتی وابستگی کے علاوہ اردو کی نئی پود کی ذہنی نشوونما اورتربیت کا ذمہ بھی انھوں نے پال رکھا تھا۔انھیں اردو کے کلاسیکی، جدید اور مابعد جدید ادب پر یکساں عبور حاصل تھا۔''

(سہ ماہی ''اصنافِ ادب'' مظفرپور۔''قمراعظم ہاشمی نمبر''۔ص:۴۷)

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں :

''قمراعظم ہاشمی کی ادبی شخصیت کا ایک نمایاں پہلوان کی تنقید نگاری ہے۔انھوں نے ادبی موضوعات پر بے شمار مضامین لکھے جن میں ان کی ناقدانہ صلاحیت اوربہترین ادبی شعور کا اظہار ہوا۔قمراعظم ہاشمی کی تنقید میں روایت کا احترام اور جدید تبدیلیوں کا استقبال پایا جاتا ہے۔وہ اخلاقی وانسانی قدروں کی بالادستی ہر حال میں چاہتے ہیں۔انھوں نے شعروادب کے سماجی اوراخلاقی سروکار

پر ہمیشہ زور دیا۔وہ مغرب کے مادی افکار ونظریات سے مرعوب نہیں ہوئے اور انھوں نے ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی تحریکوں سے الگ رہ کر ادب وشعر کی جانچ پرکھ کا فریضہ انجام دیا۔وہ پروفیسر اختر اورینوی اور پروفیسر عبدالمغنی کی طرح ادب میں اعتدال پسندی کی راہ پر گامزن رہے۔''

(زبان وادب: گوشہ ''قمر اعظم ہاشمی''۔ص:۴۶)

پروفیسر منظر اعجاز :

''ہاشمی صاحب اپنی ذات میں ہی ایک وقیع شعبۂ اردو کی حیثیت رکھتے تھے۔اس کے علاوہ انھوں نے اپنی رہائش گاہ کے وسیع ہال کو بھی ایک جامعہ یا مدرسہ کی نوعیت دے رکھی تھی۔اسی ہال کے ایک گوشے کو انھوں نے لائبریری بنا رکھا تھا۔مجھے خوش قسمتی سے دونوں پہلوؤں سے ان سے استفادہ کا موقع ملتا رہا۔حالانکہ میرے ساتھ بدنصیبی یہ تھی کہ میں اپنی دوسری مصروفیات ومشاغل کی وجہ سے ان سے اور ان کی لائبریری سے اس قدر فائدہ نہ اٹھا سکا جس قدر اس کا امکان تھا۔ہاشمی صاحب ہر جگہ اور ہر وقت استاد ہی تھے۔کالج سے یونیورسٹی تک اور بازار سے گھر تک،یعنی کوئی بھی طالب علم بلا تامل کہیں بھی ان سے استفادہ کرسکتا تھا۔''

(''تاثرات اور تجزیے''مصنفہ۔ڈاکٹر منظر اعجاز۔ص:۱۰۱)

پروفیسر سید حسن عباس :

''استاد محترم پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کی شخصیت ایسے کمالات وصفات کا مجموعہ ہے جس کے بارے میں کسی ایک مجلس میں اظہار خیال ممکن نہیں۔وہ علم وادب کا ایسا مینار ہیں جس کی بلندی پر ہمیں فخر ہے۔انھوں نے اپنی علمی کاوشوں سے تنقید وتحقیق کے شاہکار پیش کیے ہیں۔ان کی تنقیدی صلاحیتوں کے سبھی معترف ہیں۔منطقی اور استدلالی تنقید کا یہ انداز ہمیشہ نئے آفاق کی تخلیق کرتا ہے اور اس کا مشاہدہ آپ

پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کے تنقیدی مضامین کے مجموعوں میں کرسکتے ہیں۔مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید۔''

(پروفیسر قمر اعظم ہاشمی: ایک ہمہ جہت شخصیت۔مرتبہ: ڈاکٹر ولی احمد ولی۔ص:۱۱۶)

پروفیسر توقیر عالم :

''پروفیسر قمر اعظم ہاشمی نے اپنی پوری زندگی بامقصد کاموں میں گزاری۔اردو سے انھیں والہانہ محبت تھی۔وہ نہ صرف اردو زبان وادب کے معروف استاد اور نامور ادیب وناقد کی حیثیت سے مشہور رہے بلکہ بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دلانے کی کوششوں میں ان کا نمایاں رول رہا ہے۔پروفیسر ہاشمی نے پروفیسر شکیل الرحمٰن صاحب کی وائس چانسلری کے زمانہ میں بہار یونیورسٹی میں شعبۂ فارسی اور شعبۂ اردو کو الگ کرایا جو یونیورسٹی کے زمانۂ قیام سے ایک ساتھ تھے۔پروفیسر ہاشمی کی کاوش کے نتیجے میں ہی دونوں شعبے علیحدہ ہوئے اور اس کے آزادانہ فروغ کے امکانات روشن ہوئے۔موصوف اپنے اس کارنامے کے لیے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔''

(سہ ماہی ''اصنافِ ادب''مظفر پور۔''قمر اعظم ہاشمی نمبر''۔ص:۵۰)

پروفیسر ابوذر کمال الدین :

''اردو دنیا میں ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی کا نام محتاجِ تعارف نہیں ہے۔آپ بہار کے ان مایۂ ناز اور محنتی اساتذہ میں سے ایک ہیں جن کو بجا طور پر اردو زبان وادب کی آبرو کہا جاسکتا ہے۔آپ ایک اچھے محنتی شفیق استاد ہی نہیں بلکہ بلند پایہ انشاپرداز،محقق،مبصّر اور ناقد بھی ہیں۔آپ نے اپنی تصنیفات اور تحقیقات کے ذریعہ نہ صرف اردو ادب کو مالا مال کیا ہے بلکہ اس کو نئی جہت اور نئی اونچائیاں عطا کی ہیں۔میں نے بہت کم لوگوں کو اتنی جانکاہی اور محنت کرتے دیکھا ہے جتنا قمر اعظم ہاشمی صاحب کرتے رہے ہیں۔انھوں نے اردو زبان وادب کو اس

طبقہ تک پہنچایا اوران کو اردو زبان وادب کی شعوروآگہی عطا کی جن کی اگر صحیح ڈھنگ سے آبیاری نہیں کی جاتی تو نہ صرف یہ کہ وہ اردو زبان سے واقف نہیں ہوتے بلکہ کب کا تعلیم چھوڑ کر کھیتوں میں پھاوڑا چلا رہے ہوتے۔''

(پروفیسر قمر اعظم ہاشمی: ایک ہمہ جہت شخصت۔مرتبہ: ڈاکٹر ولی احمد ولیؔ۔ص:۱۰۱)

ڈاکٹر ظاہر حسین شمشاد :

''علم وادب میں تحقیق وتنقید کو نیا آب ورنگ اور زندگی سے قریب تر کرنے میں قمر صاحب کا جو حصّہ ہے وہ کسی توضیح وتشریح سے مبرّا ہے۔ان کا جو ادبی سرمایہ ہے وہ مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے اور آنے والی نسلیں اس بیش بہا سرمایہ سے مستفید ہوتی رہیں گی۔انھوں نے اردو ادب کی کئی اصناف پر اپنے نقوش چھوڑے ہیں۔ان کی نگرانی میں تقریباً ۷۰؍ریسرچ اسکالرز کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی۔موصوف کی مرکزی حیثیت ایک دیدہ ور محقق، معتبر نقاد اور شفیق استاد کی رہی ہے۔''

(پروفیسر قمر اعظم ہاشمی: ایک ہمہ جہت شخصیت۔مرتبہ: ڈاکٹر ولی احمد ولیؔ۔ص:۸۸)

ڈاکٹر مشتاق احمد :

''پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کی حیات پر سرسری نگاہ ڈالنے سے ہی یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ انھوں نے تمام عمر زبان وادب کے پودوں کی آبیاری میں اپنا خونِ جگر صرف کیا۔تحقیق وتنقید ان کا خاص میدان رہا۔درس وتدریس کے پیشے سے وابستگی نے انھیں یہ موقع فراہم کیا کہ ان کا رشتہ ہمیشہ کتابوں سے رہا۔یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقات میں گہرائی اور گیرائی نظر آتی ہے۔کیونکہ ان کا مطالعہ وسیع تھا اور زبان وادب کے تئیں صحت مند فکر کے حامل تھے۔ان کی تنقیدی آرا بھی نپی تلی ہوتی تھی۔ان کی تحریروں میں کہیں بھی ابہام نظر نہیں آتا۔جیسا کہ پروفیسر شکیل الرحمٰن نے ان کے متعلق لکھا ہے: اُن کی تحریروں میں ایک باشعور محقق اور دیدہ ورنقاد کی پہچان ہوتی ہے۔ان کے بہت سے قیمتی مقالے ہندوستان کے مختلف

رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔''

(روزنامہ ''قومی تنظیم'' پٹنہ۔مورخہ ۹؍اپریل ۲۰۱۲ء)

ڈاکٹر نجیب اختر :

''پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کی شخصیت ایک مینارۂ نور کی تھی۔مرحوم سے میرے تعلق کا عرصہ چالیس سال پر محیط ہے۔جب میں ہائی اسکول کا طالب علم تھا۔اسی وقت سے بہار کی اردو تحریک سے میری وابستگی رہی ہے اور مجھے پروفیسر موصوف کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔مرحوم ہاشمی صاحب اردو کے مخلص استاد کے ساتھ ساتھ اردو کے بے لوث خادم بھی تھے۔اردو کے سلسلے میں ان کی خدمات کے ذکر کے بغیر بہار میں اردو کی تاریخ نامکمل سمجھی جائے گی۔جب وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم نے کتنا قیمتی گوہر کھودیا ہے۔''

(سہ ماہی ''اصنافِ ادب'' مظفر پور۔قمر اعظم ہاشمی نمبر۔ص:۵۱)

ڈاکٹر اسلم جاوداں :

''پروفیسر قمر اعظم ہاشمی بہار میں اردو تحریک کے ایک اہم ستون تھے۔ان کے ذکر کے بغیر بہار کی اردو تحریک کی تاریخ ادھوری رہے گی۔اس تحریک میں مرحوم کا کردار نہایت اہم اور کلیدی رہا ہے۔ان کی شخصیت ہم لوگوں کے لیے ایک مثالی نمونہ ہے۔مرحوم کے لیے بہترین خراجِ عقیدت یہی ہے کہ اردو زبان کے فروغ کے لیے مخلصانہ جدوجہد کی جائے جس کے لیے انھوں نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔''

(سہ ماہی ''اصنافِ ادب'' مظفر پور۔''قمر اعظم ہاشمی نمبر''۔ص:۵۱)

ڈاکٹر ریحان غنی :

''پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کی وفات سے اردو ایک ممتاز ادیب، نقاد اور خادم اردو سے محروم ہوگئی ہے۔اردو کے فروغ وبقا کے لیے ان کی بیش بہا خدمات رہی ہیں جنھیں اگر یاد نہ رکھا جائے تو یہ بڑی ناانصافی اور احسان فراموشی ہوگی۔اردو تحریک آج

اس لیے ختم ہوگئی کہ اب اس تحریک کے ساتھ قمر اعظم ہاشمی جیسے مخلص لوگ نہیں رہے۔مرحوم کے لیے بہترین خراج عقیدت یہی ہے کہ اردو زبان کے فروغ کے لیے مخلصانہ جدوجہد کی جائے۔''

(سہ ماہی ''اصنافِ ادب'' مظفر پور۔قمر اعظم ہاشمی نمبر۔ص:۵۱)

ڈاکٹر بدر محمدی :

''پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کی اردو دوستی مختلف شکلوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ان کا شمار اردو زبان وادب کے معلم،اردو کے ادیب وناقد،اردو تہذیب کے مبلغ اور اردو تحریک کے روح رواں میں ہوتا ہے۔بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنوانے میں بھی ان کا کردار نمایاں رہا ہے۔زندگی کی ستّر بہاریں دیکھ چکے پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کی قلمی اور علمی خدمات کی بہتات اس قدر ہے کہ اس کا جزوی مطالعہ بھی ہاشمی شناسی کے لیے کافی ہے۔''

(سہ ماہی ''اصنافِ ادب'' مظفر پور۔قمر اعظم ہاشمی نمبر۔ص:۵۲)

ڈاکٹر ابوبکر رضوی :

''ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی کی تنقید نگاری تنقید کی اس روایت کی توسیع میں معاون ثابت ہوئی جس کی ابتدا ڈاکٹر اختر اورینوی نے کی تھی۔اختر اورینوی کی تنقید بنیادی طور پر اعتدال وتوازن کی خوشگوار فضا کی تشکیل کی دیانتدارانہ کوشش تھی جس نے قمر اعظم ہاشمی کے یہاں معروضی نقطۂ نظر اختیار کرلیا،اسی نقطۂ نظر کی وجہ سے وہ معاصرین میں ممتاز مقام کے حامل ہیں۔انھوں نے تنقید کے مختلف مروجہ اسالیب کے تئیں بے اطمینانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شعروادب کی تفہیم کے لیے معروضیت کو لازمی قرار دیا ہے۔''

(پروفیسر قمر اعظم ہاشمی:ایک ہمہ جہت شخصت۔مرتبہ:ڈاکٹر ولی احمد ولی۔ص:۲۱۰)

عارف حسن وسطوی :

''مرحوم ہاشمی صاحب کی ہشت پہلو شخصیت کا احاطہ میرے علم اور زورقلم دونوں کے بس کے باہر کی بات ہے۔لیکن ہاں اتنا ضرور ہے کہ اگر مجھے ان کی زندگی کے حوالے سے دو باتیں رکھنے کی اجازت ہو تو میں کہوں گا کہ مرحوم کی مقناطیسی شخصیت کا جمال اور کمال ان کے تدریسی ہنر اور تحریکی عمل کے ارد گرد سب سے زیادہ گھومتا نظر آتا ہے۔ایک کامیاب مثالی استاد کے طور پر جو مقبولیت اور سرفرازی ان کے حصّہ میں آئی شاذ ونادر کسی کو نصیب ہوتی ہے۔دراصل مرحوم نے شاگردوں کی ذہن سازی اور کردار سازی کا کام اس قدر ایمانداری،خلوص نیتی،سلیقہ مندی،ہمدردی اور پائیداری کے ساتھ کیا کہ ایسی مثالیں خال خال ملتی ہیں۔''

(روزنامہ ''قومی تنظیم'' پٹنہ۔مورخہ ۲۱راپریل ۲۰۱۲ء)

کتابیات

''فکروفن''	:	قمراعظم ہاشمی	۱۹۶۳ء
''ساغرِنو''(اختراورینوی نمبر)	:	''	۱۹۶۵ء
''نقش ہائے رنگ رنگ''	:	''	۱۹۷۱ء
''اردو میں ڈرامہ نگاری''	:	''	۱۹۷۵ء
''بہار کے نظم نگار شعرا''	:	''	۱۹۷۸ء
''نصاب''	:	''	۱۹۸۳ء
''عصری ادب کا شعور''	:	''	۱۹۸۳ء
''نیا نصاب''	:	''	۱۹۸۴ء
''ضحاک: ایک تنقیدی مطالعہ''	:	''	۱۹۸۴ء
''اشعارِ اکبر''	:	''	۱۹۸۵ء
''مثنوی سحرالبیان''	:	''	۱۹۸۵ء
''واردات''	:	''	۱۹۹۱ء
''ادبیات''	:	''	۱۹۹۱ء
''انتخابِ ذوق''	:	''	۱۹۹۲ء
''مضامین''	:	''	۱۹۹۴ء
''سرسری اس جہان سے گزرے''	:	''	۲۰۰۸ء
''عرب امارات کا سفری دورانیہ''	:	''	۲۰۱۰ء
''ادبی تقویمات''	:	ارشد مسعود ہاشمی	۲۰۰۸ء

''اختر شناسی''(ساغرنو کے منتخب مضامین کا مجموعہ)		''	۲۰۰۸ء
''قمراعظم ہاشمی کی تنقید نگاری''	:	ڈاکٹر ابوبکر رضوی	۲۰۰۰ء
''پروفیسر قمراعظم ہاشمی۔ایک ہمہ جہت شخصیت''		ڈاکٹر ولی احمد ولی	۲۰۰۶ء
''آئینہ پسِ آئینہ''(تبصرے اور محاکمے)		ڈاکٹر ارشد مسعود ہاشمی	۲۰۱۲ء
''تصوّرات''	:	عبدالمغنی	۱۹۸۸ء
''فنِ تنقید اور تنقیدی مضامین''	:	نجم الہدیٰ	۱۹۶۶ء
''تاثرات اور تجزیے''	:	ڈاکٹر منظر اعجاز	۲۰۱۳ء
''رشحاتِ قلم''	:	انوارالحسن وسطوی	۲۰۱۱ء

رسائل/اخبارات :

''تمثیلِ نو'' دربھنگہ	:	مدیر: ڈاکٹر امام اعظم (جنوری تا مارچ ۲۰۰۲ء)
''زبان وادب'' پٹنہ	:	اپریل ۲۰۱۲ء
''زبان وادب'' پٹنہ	:	مئی ۲۰۱۲ء
ماہنامہ ''آج کل'' نئی دہلی	:	مئی ۲۰۱۲ء
روزنامہ ''قومی تنظیم'' پٹنہ (ادبیات ایڈیشن)	:	۱۳؍مئی ۲۰۱۲ء
ماہنامہ ''اردو دنیا'' نئی دہلی	:	اگست ۲۰۱۲ء
سہ ماہی ''اصنافِ ادب'' مظفرپور (قمراعظم ہاشمی نمبر)	:	(اکتوبر ۲۰۱۴ء تا ستمبر ۲۰۱۵ء)

ختم شد